1512

منجانب مقصود زاہدی
۲۳ جنوری

ذکر و فکر

مقصود زاہدی

۸ر

ملنے کے پتے

زاہدی برادرز — ۱۰۶۔زاہدیان میرٹھ

مکتبۂ ساغر، ادبی مرکز، میرٹھ

مقصود

قدیم اور جدید ادب میں شعوری اور غیر شعوری عناصر کا نظریاتی فرق ہے۔ مجھے نہایت مسرت ہے کہ میں یہ چند سطریں ایک ایسی کتاب کے متعلق لکھ رہا ہوں جو ہر چند مقصود زاہدی صاحب کی پہلی کوشش ہے۔ لیکن بہت بڑی حد تک شعوری ادب کی حامل ہے۔

مقصود صاحب نوجوان ہیں، جذباتِ شباب کا تقاضہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ انکے دماغ و ذہن، روح و دل اور ان کی زندگی کے ہر گوشہ میں رومانی تأثرات اپنا تانا بانا بنتے اور ان کو رومان کے جال میں پھانس کر اسیرِ تخیل کر دیتے، لیکن اس کتاب کے مضامین اور چھوٹی کہانیاں صاف بتا رہی ہیں کہ مدہوش جوانی کے مقابلے میں زندگی کے تلخ تجربات مقصود کے دل پر گہرا نقش چھوڑتے ہیں۔

میں اسپر زور نہیں دوں گا کہ مقصود کی یہ کوئی رفیع منزل ہے۔ لیکن میلے کو "دکھنی لگ" فریب خیال، یہ چھوٹے چھوٹے خاکے، پتہ دیتے ہیں کہ مقصود زندگی کی اُن گلیوں میں گھوم کر آیا ہے جہاں رومان زادوں کا دم گھٹتا ہے، یہ تمام کے تمام واقعیت نگاری کے آئینہ دار ہیں اور شہادت دیتے ہیں کہ مقصود کی قوتِ مشاہدہ باریک سے باریک اور لطیف سے لطیف چیزوں کو دیکھنے کی اہلیت رکھتی ہے۔

سب سے بڑی خصوصیت ان مضامین اور خاکوں کی وہ صلاحیت ہے جو اپنی تکمیل

کے امکانات کی ۔ ۔ ۔ خود ہی ضامن ہے۔ اور دوسری خصوصیت وہ ترقی پسند نقطۂ نگاہ، جو مقصود کو ادب کے حاضر تقاضات سے ہم دوش کرتا ہے۔

اس کتاب میں جتنے سیاسی، سماجی اور نفسیاتی مسائل کو چھیڑا گیا ہے، ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نقل یا شوق کے طور پر نہیں چھیڑے گئے ہیں، بلکہ مصنف نے ان مسائل پر اپنی تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں غور کیا ہے، گویا یہ ایک ایسا مجموعہ ہے جسے فکر کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے، تخیّل کا نہیں۔

ان کی زبان، رواں، سادہ اور جاندار ہے۔ جا بجا ہلکے اور مہذّب مزاحی چھینٹے، مصنف کی گوارا فطرت کے شاہد ہیں۔ منظر نگاری میں وہ روسی افسانہ نگاروں کی طرح جزئیات کا بہت خیال رکھتے ہیں،

یہ مقصود کی پہلی کوشش ہے، میرے خیال سے انہیں اس پر ناز نہیں کرنا چاہئیے کیونکہ یہ نوید ان کے لئے شاید کم نہیں کہ ایک جدید مصنف ان کی روح میں بیدار ہو رہا ہے۔ زمانہ شدید ہے، اور نسل انسانی شدید تر، لیکن ہماری تمام اخلاقی و ادبی جد و جہد زمانے اور نسل انسانی ہی کے لئے ہے اسلئے ہمیں انسانی سماج کے سیوک کی حیثیت سے قدم اٹھانا چاہئیے۔ اور یقین کرنا چاہئیے کہ ہماری خود اعتقادی اور اخلاص زمانے اور انسان کی شدّت کو مغلوب کر سکتے ہیں۔

میں یقین کرتا ہوں کہ ملک مقصود کو گوہر مقصود سمجھکر ہاتھوں ہاتھ لے گا"۔ اور اپنی ہمّت افزائی سے اُس مصنف کو جگانے کی کوشش کرے گا جو مقصود کی روح میں بیدار ہو رہا ہے۔

میرا مخلصانہ خیر مقدم یہی ہے کہ میں ان سطور سے آنیوالے مصنف کو وسعت قلب اور

دلی مسرت کیساتھ اس لئے خوش آمدید کہہ رہا ہوں کہ۔ ؎
قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں !؟

ادبی مرکز میرٹھ
۱۹ر جون سنہ ۱۹۴۱ء

ساغر نظامی
۱۹/۶/۴۱

فہرست مضامین

ماحول

پہلے پہل جب لفظ ماحول کے معنی سمجھنے کی ضرورت میں نے محسوس کی تھی اس وقت میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ کس طرح اس لفظ کے معنی جاننے کے لئے میں یکے بعد دیگرے اپنے بزرگوں کے پاس کتاب لئے لئے پھرا تھا اور انہیں مجھے اس کا مفہوم سمجھانے میں کس قدر دشواریاں پیش آئی تھیں۔ اس کے بعد یہ لفظ بار بار سنا، جگہ جگہ پڑھا یہاں تک کہ اس کا محل استعمال مجھے قطعی طور پر آ گیا اور میں نے بھی اپنی بول چال میں اس کا استعمال آزادانہ طور پر شروع کر دیا۔

اب کچھ عرصے سے میں ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ شاعر اور ادیب، سیاسی رہنما اور جرنلسٹ سب کے سب بے تکان اس لفظ کو استعمال کر رہے ہیں لیکن پھر بھی کوئی ایسے خاص معنی اسمیں ابھی تک پوشیدہ ہیں جنھیں لوگ سمجھنا اور دوسروں کو سمجھانا چاہتے ہیں۔ ہر اخبار کے ایڈیٹوریل میں، ہر نیتا کی تقریر میں، ہر افسانہ نگار کے افسانے میں "ماحول" کا لفظ ضرور مل جاتا ہے اور اس بیسویں صدی کی ہندوستان کی سب سے حیرت انگیز ایجاد یعنی ترقی پسند ادب کی تو گویا بنیاد ہی اس لفظ پر رکھی گئی ہے۔ اس ادب کے ماتحت جس قدر بھی اصناف سخن آئی ہیں خواہ وہ نثر ہوں یا نظم ایسا معلوم ہوتا ہے گویا سب میں اسی

ایک لفظ کی گردان کی جا رہی ہے۔ اِس سے پیدا ہونے والے بے شمار مطالب اور مفاہیم لوگوں کے دماغوں میں بٹھائے جا رہے ہیں۔ ہر مضمون اِسی ایک لفظ کی شرحِ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اِس جہالت کا بُرا ہو کہ اِس لفظ کو سُن کر بوکھلانے والوں کی تعداد اب بھی خدا کے فضل سے اَن گنت ہے۔ لاکھوں افراد ابھی تک بار بار شرح و بسط کے ساتھ بتائے جانے کے باوجود اِس لفظ کو سُن کر استعمال کرنے والے کا منہ تکنے لگتے ہیں۔

تو یوں کہئے کہ ماحول کیا ایک معمّہ ہو گیا جو نہ سمجھا جاتا ہے اور نہ سمجھایا جاتا ہے۔ ہمارے روزمرّہ میں کچھ ایسے الفاظ اور اصطلاحیں ضرور داخل ہیں جنہیں ازل سے سمجھنے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن پھر بھی ابھی تک کوئی اُن کی تہ کو نہیں پہنچا۔ کچھ دانائے راز ایسے ہیں جو اُن اصطلاحوں کے پوشیدہ معانی کو سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن جب کبھی وہ معانی لوگوں کے روبرو پیش کئے جاتے ہیں۔ تو سوائے اسکے کہ سُننے والے کہنے والے کے علم و عرفان پر صلِّ علیٰ اور سُبحان اللہ کہہ اُٹھیں اور کچھ حاصل نظر نہیں آتا۔

مگر ماحول ——— ماحول ہرگز اُس قسم کا لفظ نہیں ہے۔ جس طرح آپ "سوسائٹی" کے مفہوم کو سمجھ جاتے ہیں۔ جیسے آپ قوم اور قبیلے کے الفاظ سے وہی مطلب پا لیتے ہیں جو کہنے والے کے ذہن میں ہوتے ہیں بالکل اِسی طرح آپ ماحول کا مطلب بھی فوراً سمجھ سکتے ہیں۔ جس طرح آپ سماج کے حالات دیکھ سکتے ہیں محسوس کر سکتے ہیں بالکل اُسی انداز میں آپ ماحول کو بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اور اُسے محسوس کر سکتے ہیں۔

گذشتہ صدی کے آخر میں ہندوستان کے چند سربرآوردہ حضرات نے نیچر کا لفظ عوام کے روبرو پیش کرنا شروع کیا تھا۔ ابتداً لوگ اس لفظ پر خوب خوب چڑبڑائے۔ اس کے انوکھے پن پر کافی حیرت واستعجاب ظاہر کیا لیکن رفتہ رفتہ یہ لفظ اسقدر عام ہو گیا کہ ایک خاص گروہ نیچریوں کا پیدا ہو گیا نیچریے شاعر، نیچریے ادیب اور نیچریے نہ جانے کیا کیا معرض وجود میں آگئے اور باوجودیکہ یہ اصطلاح انگریزی زبان سے آئی تھی لیکن تھوڑی بہت جدوجہد کے بعد ہندوستانیوں میں مقبول ہو ہی گئی۔ بس اسی طرح یہ سمجھنا چاہیئے کہ موجودہ دَور ماحول کا دَور ہے اور چونکہ یہ لفظ سات سمندر پار سے نہیں آیا ہے بلکہ اسی ملک میں کم وبیش ایک ہزار سال سے آباد ہے اس لئے اگر ہم اسے نیچر کے مقابلہ میں زیادہ جلد نہیں سمجھیں گے تو تعجب کی بات ہوگی۔

آج یہ کیفیت ہے کہ ہر مصلح قوم اسٹیج پر یہی کہتا نظر آتا ہے "ہم ہندوستانی اپنے ماحول کی بندشوں میں جکڑے ہوئے ہیں"۔ ہر لیڈر بار بار اس لفظ کو طرح طرح سے دُہراتا رہتا ہے۔ کبھی وہ کہتا ہے "ہمیں اپنے غلط ماحول سے لڑنا چاہیئے"۔ کبھی کہتا ہے "صحیح ماحول پیدا کرنے کے لئے افراد اور جماعتوں سب کی متفقہ مساعی کی ضرورت ہے" اور شاعر اور ادیب تو جو کچھ بھی کہتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ اُس تمام کا پس منظر ہی ماحول ہوتا ہے۔ بھلا اس صورت میں ہماری یہ بیگانگی کی ادا کب تک جاری رہ سکتی ہے۔ جو چیز اس طرح ہمارے اندر موجود ہے ہم اُس سے کب تک پہلو تہی کرتے رہیں گے۔ بالآخر ہمیں سمجھنا ہی پڑے گا کہ آخر یہ ماحول ہے کیا بلا۔

جب اوّل سمجھنا آخر سمجھنا تو پھر ابھی کیوں نہ سمجھتے چلیں۔ ماحول درصل نام ہے اُس گردو پیش کا جس میں ہم گھرے ہوتے ہیں۔ جس میں ہم بستے بستے ہیں۔ مثلاً یوں سمجھئے کہ میرا ماحول وہ تمام اشیاء، صورتیں اور تخیلات ہیں جن سے میں روزانہ دوچار ہوتا رہتا ہوں۔ اسمیں جہاں میرے عزیز و اقربا دوست احباب آجاتے ہیں وہاں وہ تمام تخیلات اور تصورات۔ وہ تمام میلانات اور رجحانات، روایتیں اور رسم و رواج بھی آجاتے ہیں، جو میری اور میرے گردو پیش رہنے والی ہستیوں کی زندگیوں میں سرایت کرچکے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر اگر میرے پڑوس میں جو اری بھنڈاری بستے ہیں وہ بھی میرے ماحول کا ایک جز ہیں اور جو محنت مزدوری کرنے والے انسان آباد ہیں وہ بھی میرے ماحول کا ایک عنصر ہیں۔ جو افلاس اور ناداری کے گرداب میں پھنسے ہوئے بے بس اور مقہور انسان میں اپنے اردگرد دیکھتا ہوں وہ بھی اسی میں شریک ہیں اور مطمئن اور شکم سیر، نخوت پسند، دماغ دار انسان بھی اسی میں شامل ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اینٹ پتھر کے بنے ہوئے مکانات۔ کچی پھوس کی جھونپڑیاں۔ ضروریات زندگی کا جملہ سامان۔ عیش و عشرت اور آرائش و زیبائش کے جملہ لوازمات بھی باوجود بے جان ہونے کے ہمارے ماحول میں شمار ہوتے ہیں۔ کیونکہ جس طرح جاندار ہستیاں ہم پر اثر انداز ہوتی ہیں ایسے ہی ان اشیاء کی موجودگی اور غیر موجودگی بھی ہماری فطرت اور کردار کے ڈھالنے میں حصہ لیتی ہے۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ افراد ایک ماحول کو چھوڑ کر دوسرے ماحول کو اختیا

کر لیتے ہیں۔ جو لوگ عقل و علم کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہو جاتے ہیں۔ اور زندگی میں خوب سے خوب تر اشیاء کی تلاش کرنے لگتے ہیں وہ کبھی نکمّے اور پست ماحول پر قانع نہیں رہتے بلکہ اپنی ذات اور صفات کے اظہار اور پھیلاؤ کے لئے بہتر اور برتر ماحول تلاش کر ہی لیتے ہیں۔ برخلاف اِس کے جن لوگوں میں خود آگاہی اور خودداری کے جذبات نشو و نما نہیں پاتے اور جو کھوٹے اور کھرے کی تمیز کرنے سے عاری ہوتے ہیں وہ زیادہ تر پست ماحول ہی میں پڑے رہ جاتے ہیں۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ افراد غیر ارادی طور پر ایک ماحول سے دوسرے ماحول میں جا پڑتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ اُسی کے اثرات بھی قبول کرنے لگتے ہیں لیکن جب ایسے اتفاقات پیش آتے ہیں تو لوگوں کو بڑی کشمکش کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ ہر ماحول اپنے حالات کے اعتبار سے دوسرے سے بہت کچھ اختلافات رکھتا ہے اور جس ماحول میں ہم اپنی زندگی کے ایک معقول حصّے کو گزار لیتے ہیں اُس کے اثرات ہمارے رگ و ریشے میں اُتر جاتے ہیں اور بہت مشکل سے دور ہوتے ہیں۔ مگر زیادہ تر حالات میں یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ انسان کا ابتدائی ماحول ہی اُس پر غالب آجاتا ہے اور وہ مجبوراً خواہ مخواہ اُس پر قناعت کر ہی لیتا ہے اور کچھ اس طرح کہ اُسے اس کا احساس بھی نہیں ہونے پاتا۔

اِس دُنیا میں ہر انسان ہوش سنبھالتے ہی خود کو ایک مخصوص ماحول میں گِھرا ہوا پاتا ہے۔ اُسی ماحول میں اُس کی ذہنی اور جسمانی نشو و نما ہوتی ہے

اُسی میں رہ کر اُس کی صلاحیتیں اور قوتیں تربیت پاکر پنپتی ہیں اور اُسی ماحول کی ایک ایک شے اُس شخص کی زندگی کا جزو لاینفک بن جاتی ہیں۔ اُس کے عادات و خصائل۔ اُس کی زندگی کی مصروفیات، اُس کے خیالات، محسوسات، اُس کی وضع قطع، چال ڈھال، طرزِ رفتار، طرزِ گفتار، غرض اُس کی تمام زندگی اُسی ماحول کی آئینہ دار بن جاتی ہے جس میں وہ پرورش پاتا ہے، پروان چڑھتا ہے۔ اگر ہم ایک بھنگی کو مثال کے طور پر لے لیں تو ہم سمجھ جائینگے کہ وہ بھنگی کیوں کہلاتا ہے اور یہ کہ وہ بھنگی کیوں ہے۔

وہ بھنگی اس لئے ہے کہ اس نے ایک اچھوت ماں کی گود میں آنکھیں کھولیں اور ایک اچھوت باپ کا سایہ اپنے سر پر دیکھا۔ وہ جتنا جتنا ہوش سنبھالتا گیا اُسی مناسبت کے ساتھ وہ اپنے ماحول سے مانوس ہوتا گیا اور اُس ماحول نے جو چیزیں اُس کے روبرو رکھیں وہ بُری ہوتے ہوئے بھی اُس کے لئے قابل قبول ہوتی گئیں۔ یہانتک کہ وہ زمانہ بھی آگیا کہ اُس کی زندگی جھاڑو پنجر۔ کوڑا کرکٹ، سنڈاس اور نالی چند الفاظ کا ایک مرکب بن کر رہ گئی۔ رفتہ رفتہ اُس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اُس کی تخلیق کا اگر کوئی منشا ہے تو وہ دُنیا کے تمام غلیظ اور گندے کام انجام دینا ہے اور اونچی ذات والوں کی دُھتکار اور گالیاں سُننا اُس کا فرض۔ اُسے یہ بھی سمجھا دیا جاتا ہے کہ اُس کی سوشل حالت مشیت ایزدی پر مبنی ہے اور اس سے ایک انچ ترقی کرنا اُس کی قسمت میں نہیں ہے۔ بالآخر وہ محض ایک بھنگی رہجاتا ہے جب اُس نے آنکھیں کھولی تھیں تب بھی وہ بھنگی ہی تھا اور جب اُس نے

آنکھیں موندلیں اُس وقت بھی وہ بھنگی ہی رہا۔

اسی طرح ہم ہر انسان کو اُس کے ماحول سے پہچان لیتے ہیں خواہ اُس میں کوئی دُھنا جلاہا ہو یا تیلی تنبولی، بھنگی چمار ہو، یا مغل پٹھان، ویش برہمن ہو یا قصائی کھوجڑا۔ اِس سے بھی بڑھ کر اگر ایک امیر آدمی کی نخوت اور رعونت اُس کے ماحولاتی اثرات کی نمائندگی کرتی ہیں تو ایک مفلس قلاش کی بُزدلانہ اور خوشامدانہ حرکتیں بھی اُسی ماحول کی کارفرمائیوں کا نتیجہ ہیں۔ اگر ایک طرف کسی عالم کی علمیت کسی فلسفی کا فلسفہ کسی شاعر کی شاعری کم و بیش اپنے ماحول سے متأثر ہوتی ہیں تو دوسری طرف ایک جاہل انسان کی نادانی اور جہالت ایک اَن پڑھ انسان کی زندگی کا بدسلیقہ پن اور بے قاعدگی اور ایک پست ماحول سے اُبھرنے والے انسان کی کثافت اور غلاظت بھی اسی ماحول کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اسی ماحول کے اثرات اور اشاروں سے انسان کی صلاحیتیں اُجاگر ہو کر اپنے گرد و پیش روشنی پھیلا دیتی ہیں اور اسی کی کرشمہ سازیوں سے انسانوں کی عقل اندھی ہو جاتی ہے اور وہ اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی تیرگی میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

جوشؔ ملیح آبادی نے انسان کی مجبوری اور مظلومیت کی تصویر کھینچتے ہوئے کہا ہے۔ ؎

دیکھتا کیا ہوں کہ ماحول و وراثت کا جوا   نوعِ انساں کے سبک شانے پہ ہے رکھا ہوا
فطرت و طینت سرشت و تربیت طبع و ضمیر   ایک انساں اور اتنے قید خانوں کا اسیر

جوش نے تو اتنے الفاظ استعمال کئے ہیں لیکن میں صرف یہ کہتا ہوں کہ انسان کے شانوں پر جو سب سے بڑا بوجھ رکھا ہوا ہے اور جس نے اُس کے قویٰ شل کر دئے ہیں وہ اُسکے ماحول کا ہے اور یہ بوجھ ایسا ہے کہ آسانی سے گرایا بھی نہیں جا سکتا۔ مگر اسی کو گرانا چاہئے۔

تعصّب

میرے ایک دوست جو چند ہی ملاقاتوں میں اپنے دل اور دماغ کی گہرائیاں مجھ پر واضح کرنے لگے تھے اکثر مجھے بتایا کرتے کہ نوعِ انسانی کی بے بسی اور مجبوریوں کا اگر کوئی واحد علاج ہو سکتا ہے تو وہ "وفاقِ عالم" ہے۔ بظاہر یہ بات ناممکن سی نظر آتی ہے لیکن جب وہ سمجھاتے تھے کہ "وفاقِ عالم" کا آخر منشا کیا ہے اور یہ کہ وفاقِ عالم قائم ہو جانے کی صورت میں کس طرح افراد اور جماعتوں کو سیاسی اور اقتصادی الجھنوں سے چھڑا کر اُن کو قومی مُلکی اور نسلی تعصبات سے رہا کیا جا سکتا ہے ــــ اور ایک ہمہ گیر سماجی نظام تمام روئے زمین پر جاری کر کے کس طرح حق اور انصاف کے ذریعہ سب کو زندگی کے ذرائع پر قریب قریب مساوی حقوق بخشے جا سکتے ہیں۔ تو واقعی مجھے بھی اُمید کی صورتیں نظر آنے لگتی تھیں۔ وہ میرے سامنے وفاقِ عالم سے پیدا ہونے والی اُن چند در چند سہولیتوں کو پیش کیا کرتے جن کے ذریعے سے انسانی صلاحیتیں بڑھ کر کائنات کے تمام اسرار و رموز پر حاوی ہو سکتی ہیں اور میں اپنے دل میں سوچا کرتا کہ فی الحقیقت اگر ایسا ہو جائے جیسا کہ میرے دور اندیش دوست فرماتے ہیں تو عالمِ انسانی کو کتنے دکھوں سے چھٹکارا مل جائے۔

ممکن تھا کہ اگر کچھ عرصے وہ اور اسی طرح مجھے لیکچر دیتے رہتے تو میں بھی اُن کی طرح وفاقِ عالم کو اپنی فکر و نظر کا معیار بنا لیتا اور اُس کی تبلیغ شروع کر دیتا لیکن ایک دن انہی کی زبانی کچھ باتیں سُن کر میں ورطۂ حیرت میں پڑ گیا۔ وہ فرمانے لگے۔ "میں اس بات پر کامل یقین رکھتا کہ انسانوں کے کچھ گروہ بہت ہی نمایاں خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں اور وہ اُن میں اس بُری طرح گھر کر جاتی ہیں کہ اُس گروہ کے ہر فرد میں اُن کا ظہور کسی نہ کسی موقعہ پر ہو ہی جاتا ہے"۔ یہ بات جہاں میرے لئے بحث کا دروازہ کھول رہی تھی وہاں میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ درحقیقت کچھ اقوام اور انسانی برادری کے کچھ گروہ اپنے ماحول اور جغرافیائی اور تاریخی اسباب کی بنا پر کچھ مخصوص تل طور رکھتے ہیں اور وہ بہر عنوان ظاہر ہو کر ہی رہتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ بات کسی گذشتہ سے پیوستہ نہیں تھی اور یک لخت اُنہوں نے دوران گفتگو میں پیش کر دی تھی اس لئے میں نے اس کا منشاء سمجھنے کے لئے کچھ وضاحت چاہی تو وہ فرمانے لگے "میرا کچھ عقیدہ سا ہو چلا ہے کہ وہ اقوام جن کی نسبت عرصے سے روایتی سوءِ ظن چلا آتا ہے اپنی فطرت کے اعتبار سے کچھ ہوتی ہی خطرناک ہیں"۔ اور پھر وہ پٹھانوں اور کمبوہوں کے بارے میں کچھ انکشافات کرنے لگے۔

میں اُن کی اس بات پر یقین کر تو لیتا۔ لیکن جب میں نے اُس تفاوت خیال پر غور کیا جو "وفاقِ عالم" جیسے ہمہ گیر تصوّر اور اس متعصب عقیدہ میں پایا جاتا تھا تو میں نے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس کی اور جب کہنے پر آیا تو اتنا کچھ کہا کہ اگر وہ میرے دماغ میں یہ تعصّب جاگزیں کرنے کا خیال اپنے دماغ میں

شدت کے ساتھ نہ لیئے ہوتے تو یقیناً گھبرا کر موضوع بدل دیتے۔ لیکن جس طرح وہ "وفاقِ عالم" کے تخیل پر نہایت شد و مد اور ایمان و ایقان کے ساتھ اڑ جایا کرتے تھے اور فریقِ مخالف کے تمام اعتراضات کا استقبال کیا کرتے تھے اسی طرح وہ اس بات پر بھی جم گئے اور اُسے پایۂ ثبوت تک پہونچانے کے لیئے اُنھوں نے کچھ شعراء کے اشعار اور کچھ مروجہ ضرب الامثال سُنائیں اور دو ایک مثالیں ایسی بھی پیش کیں جن میں اُن کا ذاتی تلخ تجربہ شامل تھا۔

بحث نہ جانے کتنا طول کھینچتی لیکن چونکہ ہماری یہ گفتگو ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ہو رہی تھی اور میری گاڑی چھوٹنے والی تھی لہذا مجبوراً سلسلہ منقطع کر دیا گیا اور میں گاڑی میں سوار ہو گیا۔ میرے دوست مجھے خدا حافظ کہکر رخصت ہو گئے اور میں اپنے دوسرے دوست کے قریب جو میرے ہمسفر تھے اور اس بحث سے قطعاً نا آشنا تھے جا بیٹھا۔ بہ حُسنِ اتفاق سے پٹھان بھی تھے اور کشمیری عنصر بھی ان میں برابر کا موجود تھا۔ میں ان کی صورت دیکھتا اور دل ہی دل میں تازہ سُنے ہوئے اِن اشعار پر غور کرتا۔ ؎

اگر قحط الرجال افتد ز سہ کس اُنس کم گیری — اول افغاں دوم کمبوہ سوم بدذات کشمیری
ز افغاں کینہ می آید ز کمبوہ حیلہ می آید — ز کشمیری نمی آید بجز اندوہ و دلگیری

میں برابر اس بات کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا اور مذکورۂ بالا بحث کے تمام رُخ مجھ پر زیادہ سے زیادہ واضح ہوتے رہے۔ میرے ہم سفر دوست میرے لڑکپن کے ساتھیوں میں سے تھے اور ان میں محبت اور دوستی کے تمام امکانی اوصاف مجھے ہمیشہ نظر آیا کرتے تھے۔ میرے ان کے تعلقات کو کم و بیش

آٹھ سال ہو لئے تھے اور اُن معمولی معمولی باتوں کے علاوہ جو قریب قریب سب دوستوں کے مابین ہوتی رہتی ہیں میں نے انہیں کبھی ان اشعار کا مصداق نہیں پایا تھا۔

میں اسی قسم کی اور رائج الوقت باتوں پر غور کرنے لگا اور جس قوم اور قبیلے کے متعلق کچھ سوچا اُسی کے بارے میں ایک نہ ایک تعصّب موجود پایا۔ جب میں اُس سوءِ ظن پر غور کرتا تو مجھے اُس کے بالکل برعکس اُسی گروہ کے محاسن نظر آنے لگتے اور وہ خیال مدھم پڑ جاتا۔ میں نے دل میں کہا " بالآخر لوگ تصویر کے تاریک پہلو ہی کو کیوں منظرِ عام پر لے آتے ہیں۔ روشن پہلو کو نظر انداز کرنے کے کیا معنی" اور اس بات کا جواب مجھے ایک مشہور کہاوت میں مل گیا " نیکی نو کوس بدی نَو سَو کوس" اور یہ ایک زبردست حقیقت ہے۔

یوں تو دُنیا کے پردہ پر کوئی مُلک ایسا نہ ہوگا جہاں کے باشندے کسی نہ کسی مصیبت کے شکار نہ ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ تعصبات کی جس قدر بھی اقسام ہو سکتی ہیں مکروہ سے مکروہ اور بدتر سے بدتر وہ سب ہندوستان میں نہایت بہتات کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ چونکہ اس مُلک میں بسنے والے انسان۔ انسانی برادری کے مختلف قبیلوں اور کنبوں سے تعلق رکھتے ہیں اور رنگ و نسل اور مذہب کے اعتبارات سے بھی ایک دوسرے سے جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں اِس لئے یہاں اس عیب جوئی کو کافی فروغ ہوا اور فتنہ انگیز افراد نے ایک دوسرے پر جو آوازے کسے وہ رفتہ رفتہ متعصب دماغوں میں جاگزین ہوتے گئے اور شدہ شدہ عوام میں رائج ہو گئے۔ جب ایک دوسرے کی مخالفت

ہی ٹھہری تو پھر محاسن کون گنے، خوبیوں پر کون نظر ڈالے اپنے رشک وحسد اور بغض وکینہ سے مملو جذبات کو راہ دینی منظور تھی چنانچہ خوب آپس میں تبرّے بازیاں کیں۔ آریہ نے غیر آریہ میں خامیاں اور کوتاہیاں ٹٹولیں۔ برہمن نے نا برہمن کو حقیر گردانا۔ مسلمان نے ہندو کے بارے میں غلط تصورات قائم کئے اور بالآخر ہندوستانیوں کے دلوں اور دماغوں میں سوائے کھوٹ کے اور کچھ باقی نہ بچا۔

اگر ہم اُن گوناگوں تعصبات پر غور کریں جو ہمارے دماغوں میں شدت کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں تو ہم دیکھیں گے کہ مذہبی، نسلی، قومی اور سیاسی تعصبات نے ہماری اجتماعی زندگی میں انتشار پیدا کرنے میں بہت زبردست حصے لئے ہیں۔

مذہبی تعصب وہ ہے کہ شاید کوئی ہندوستانی اپنے دل پہ ہاتھ رکھکر یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس سے بری ہے۔ بڑے بڑے وسیع النظر انسان جن کا مسلکِ زندگی ہی صلح کل، ہوتا ہے اور جن کا عقیدہ "با مسلمان اللہ اللہ با برہمن رام رام" ہوتا ہے۔ ذرا سی تحریک پر مذہبی تعصب برتنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اگر کوئی مسلمان ہے تو اُسے مذہب اسلام سے زیادہ سچّا اور اچھا مذہب اور کوئی نظر نہیں آتا اور ہر مذہب میں اُسے ہزار در ہزار خامیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ اسی طرح ایک ہندو اور عیسائی کو اپنے اپنے مذاہب میں سرخاب کے پر لگے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کوئی بھی اپنے بیروں کو کھٹّا بتانے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا۔ اگر مقابلہ صرف زبانی ہی ہوتا تو خیر اُس سے درگذر کیا جاسکتا تھا

لیکن یہاں تو یہ کیفیت ہے کہ ہر شخص اپنی بات منوانے کے لئے خون کے دریا بہانے پر آمادہ ہے چنانچہ تاریخ عالم اسی مذہبی تعصب کی بنا پر انسانی خون کے چھینٹوں سے رنگین بنی ہوئی ہے۔ ہندوستان میں جو قومیں ہمیشہ ایک دوسرے سے دست و گریبان رہتی ہیں وہ محض اسی مذہبی تعصب کے زیر اثر رہتی ہیں۔ اسی کے پیش نظر جو سوءظن ہم ایک دوسرے کی بابت قائم کرتے ہیں وہ تشتت اور افتراق کی خلیج کو اور بھی زیادہ وسیع کرتا رہتا ہے اور بالآخر ہم جنونیوں کی طرح ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن جاتے ہیں۔

اس تعصب کو پروان چڑھانے کے سامان ہمارے ملک میں بکثرت موجود ہیں۔ سینہ بسینہ چلنے والی روایات، فرقہ وارانہ فسادات، مناظرے اور اسی قسم کی باتیں بے پناہ اثرات ہمارے دماغوں پر چھوڑتی رہتی ہیں اور ہم اتفاق و اتحاد کی ضرورتیں محسوس کرتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے دیدہ و دانستہ دور ہوتے جاتے ہیں۔ یہ تعصب محض جاہلوں میں ہو تو چنداں تعجب کی بات نہ ہو حیرت تو اس بات کی ہے کہ پڑھے لکھے انسانوں میں بھی یہ فراوانی کے ساتھ پایا جاتا ہے اور ہر گروہ کے مذہبی رہنما اس عصبیت کو مذہبی ترقی کے لئے لازمی شے قرار دیتے ہیں۔

نسلی تعصب کی کارفرمائیاں بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ ہندوستان قدیم میں آریوں نے جو سلوک اپنی مفتوح قوم کے ساتھ کیا۔ وہ آج تک تاریخ کا سب سے گندا ورق بنا ہوا ہے۔

نسلی تعصب کی اس سے زیادہ مکروہ مثال تاریخ عالم میں اور کوئی نہیں مل سکتی جیسی ہم ہندوستان میں شودر اقوام کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ کسی فاتح قوم نے آج تک اپنی مفتوح قوم کے ساتھ ایسا وحشیانہ برتاؤ نہیں کیا جیسا آریوں نے ہندوستان میں بسنے والی قدیم نسلوں کے ساتھ کیا۔ یہ نسلی تعصّب بعد میں نت نئے رنگ اختیار کرتا گیا اور اس کی لاتعداد شاخیں پھوٹ نکلیں۔ ذات پات کی تقسیم کے ساتھ ساتھ ہر ذات کے انسان دوسری ذات والوں سے نفرت کرنے لگے۔ چھتری برہمن سے نالاں تھا اور برہمن چھتری سے بیزار۔ ویش اقوام کے لئے برہمن بھی ایک عذاب بنے ہوئے تھے اور چھتری بھی بلائے بے درماں کا حکم رکھتے تھے شودر بیچارے تو خدمت کے لئے پیدا ہوئے ہی تھے۔

مسلمانوں میں بھی پٹھانوں کی جہالت۔ عربوں کا شتر کینہ اور مغلوں کی خوں خواری ضرب المثل بن کر آئی اور ہر گروہ اور نسل کے افراد ایک دوسرے کے خلاف اپنے دماغوں میں نفرت کے بیج بوتے رہے اور اپنے اپنے اقتدار کے زمانہ میں دوسری نسلوں کے افراد کو جہاں تک بھی ممکن ہو سکا پامال کیا۔

اس کے بعد قومی تعصب آتا ہے لیکن چونکہ متحدہ قومیت کا سوال برابر ہمارے ملک میں پیدا ہوتا رہتا ہے اس لئے ہم اسے بجائے قومی تعصّب کے صوبجاتی عصبیت کے نام سے پکاریں گے۔ یہ بھی ہمارے

مُلک کی چند بڑی لعنتوں میں سے ایک ہے اور اس کی کارگذاریاں دیکھنے کے لئے ہمیں زیادہ تحقیق نہیں کرنی پڑتی۔ زندگی کے ہر شعبے میں ہم اس صوبائیت کا عمل دخل پائیں گے۔کہیں پنجابی یو۔پی کے باشندوں کے لئے عذاب بنے ہوئے ہیں اور کسی نہ کسی تعصب کے ماتحت یو۔پی کے باشندوں سے محترز رہنا اور اُنہیں نقصان پہونچانا بالکل ضروری خیال کرتے ہیں۔ تو کہیں یو۔پی والے پنجابیوں میں صدہا نقص نکال کر اُنہیں انسانیت کے زمرہ سے خارج کرتے ہوئے ملیں گے۔ اگر بنگالی اپنے بنگالی ہونے پر نازاں ہیں اور غیر صوبوں کے افراد سے بَیر رکھتے ہیں تو دوسرے صوبوں کے لوگ بھی اُن سے کچھ کم دشمنی نہیں رکھتے اگر وہ اپنے دامن کو غیریت سے آلودہ کرنا نہیں چاہتے تو دوسرے بھی اُنہیں ہمیشہ دودھ میں سے مکھی کی مانند پھینک دینے پر تلے رہتے ہیں۔ اگر دکن کے باشندے شمالی ہند کے افراد سے سخت متنفر ہیں اور اُنہیں بلا استثنا فریبی سمجھتے ہیں۔ تو شمالی ہند کے لوگ بھی دکنیوں کو نرا احمق اور گاؤدی ٹھہراتے ہیں۔ ریاستوں میں بھی یہی تعصب ضرورت سے زیادہ موجود ہے اور مُلکی غیر مُلکی کی صورت میں دن بدن بڑھتا جاتا ہے۔ اس تعصب کی سب سے زیادہ دلچسپ صورت وہ ہوتی ہے جب ایک گروہ یا ایک مقام کے لوگ سُنتے سُنتے اپنے اندر وہی تمام باتیں محسوس کرنے لگتے ہیں جو دوسروں نے محض تعصب کے ماتحت اُن سے وابستہ کردی تھیں

دوسروں کے قائم کئے ہوئے تخیلات کے سانچوں میں ڈھلے ہوئے

یہ افراد اپنے کمبوہ، افغان، اور کشمیری ہونے پر اسلئے نازاں نہیں ہوتے کہ وہ کمبوہ، افغان یا کشمیری ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ یہ ہوتے ہوئے علی الترتیب مکّار، کینہ پرور، اور ستم پیشہ بھی ہیں۔ ان میں سے ہر شخص اس بات پر کامل یقین رکھتا ہے کہ اُسے اپنے گروہ کے روایتی کردار کا پاس و لحاظ کرنا لازم ہے اور یہ کہ اُسے وہی کرنا چاہیئے جو اُس کی بابت مشہور ہے۔ ایسی حالتوں میں مشق بڑھتے بڑھتے اس حد تک جا پہونچتی ہے کہ افراد میں وہ خصوصیات فطری معلوم ہونے لگتی ہیں اور پھر لوگوں کو حوالے پیش کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے کہ مثالاً فلاں صاحب ہی کو دیکھ لیجئے۔

بعض اوقات لوگ غیض و غضب کے عالم میں یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں "دیکھئے میں پنجابی ہوں" یا یوں کہیں گے "واضح رہے کہ مَیں یو۔پی کا باشندہ ہوں" اور اسی طرح ہر مقام کا باشندہ اِسی قسم کی باتیں کہتا ہوا ملے گا۔ یہ جتانے سے اُن کا منشاء اپنی قومیت ظاہر کرنا نہیں ہوتا ہے کیونکہ ہر شخص آسانی سے پہچان لیا جاتا ہے کہ وہ بنگالی ہے یا پنجابی، یو۔پی کا باشندہ ہے یا دکن کا بلکہ اُن کا منشاء محض یہ ہوتا ہے کہ مخاطب اُن کی مشہور و معروف خطرناک خصوصیات پر غور کرے اور یہ سمجھ لے کہ مقابلہ بے ڈھب ہے۔

اسی طرح جو لوگ اِن باتوں پر ایمان لے آتے ہیں اور لوگوں کو اُن کے انفرادی اوصاف کے ذریعے نہیں بلکہ روایتی (قومی) خصوصیات کے اعتبار سے پرکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں وہ کبھی اس بات پر غور نہیں

کرتے کہ دوسروں کو وہ جن خصوصیات سے ممیّز کر رہے ہیں آیا وہ خود اُن میں بھی موجود ہیں یا نہیں - اگر پائی جاتی ہیں تو پھر دوسروں کو اُن کی بنا پر مطعون کرنا ہی بیکار ہے۔ اور اگر بفرضِ محال کوئی اپنی آنکھوں کو اتنا چوندھیا لے کہ اُسے نظر ہی نہ آئیں تو اُسے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اُس کا اپنا گروہ انسانی برادری سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ کوئی ہوائی مخلوق ہے کیونکہ انسانیت کے جس قدر بھی خواص ہیں وہ انسانی برادری کے ہر فرد میں خواہ وہ کسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو کم و بیش ضرور پائے جاتے ہیں۔

اِس تعصّب کے ماتحت ہم بعض خطّوں کے افراد کو تو قطعی طور پر حقیر و ذلیل ٹھہرا چکے ہیں۔ کسی جگہ کے لوگوں کو احمق مشہور کر دینا اور پھر اُن سے پرہیز برتتے ہوئے دُور دُور بھاگنا ایسا ہی فعل ہے جیسے کسی ہوشمند انسان کو پاگل مشہور کر کے اُس سے خوف کھانا۔ جس طرح ہمارا برتاؤ اُس ہوشمند انسان کے دماغ کا توازن خراب کر سکتا ہے ایسے ہی کسی خاص مقام کے افراد بھی جو کچھ مشہور کر دئے جاتے ہیں وہ رفتہ رفتہ وہی نظر آنے لگتے ہیں۔

انسان بھی کس بلا کا ستم ظریف ہے کہ ایک طرف تو وہ تمام دُنیا کے انسانوں کو ایک ہی رشتہ میں پرونے کی فکر کرتا ہے اور دوسری طرف افراد اور جماعتوں میں نئے نئے معیار اور امتیازات قائم کر کے انتشار اور پراگندگی پھیلاتا رہتا ہے۔

یہ تعصّبات اِس کثرت کے ساتھ ہمارے مُلک میں پائے جاتے ہیں

کہ فضا کا ذرّہ ذرّہ متعصب معلوم ہوتا ہے چنانچہ ہمارا ادب، ہماری سیاست، ہماری اجتماعی زندگی سب میں اس کے جراثیم پھیلے ہوئے ہیں اور افراد ایک عجیب کشمکش کا شکار ہیں۔ ہر فرد کی توجہات ایک تنگ دائرۂ تک محدود رہتی ہیں اور اُس سے باہر کی ہر شے سے یا تو وہ بیگانگی برتتا ہے یا پھر اُس سے کراہت محسوس کرتا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ ہر گروہ اپنی جگہ تنگ نظر ہوتا جاتا ہے لیکن وہ بجائے اپنے اوپر نظر ڈالنے کے ہمیشہ دوسرے گروہ پر اپنی نگاہِ تحقیق ڈالے گا اور اُس کے عیوب ڈھونڈ کر اُنہیں اُچھالنا شروع کر دے گا۔

اِس تعصّب کا دائرہ سمٹتا جاتا ہے اور یہ ہماری انفرادیت سے قریب تر آتا جاتا ہے۔ صوبجاتی تعصب سے ہم مقامی تعصّب پر آ جاتے ہیں اور نتیجۃً دوآبۂ گنگ و جمن کا رہنے والا پار کے باشندوں کی آنکھ میں سور کا بال نکالنے لگتا ہے۔ جواباً پار کے لوگ بھی دوآبے والوں سے نفرت کا کوئی نہ کوئی سبب پیدا کر ہی لیتے ہیں۔ پھر یہ دائرہ ہمارے خاندانوں تک آ جاتا ہے اور ہم نہایت بے باکی سے ایک دوسرے کے خاندانوں میں کیڑے نکالنے لگتے ہیں۔ آخر کار یہ تمام تعصبات سمٹ سمٹا کر ہماری ذات میں جمع ہو جاتے ہیں اور ہم گوناگوں تعصبات کا مجموعہ بنے ہوئے "وفاقِ عالم" پر نہایت شد و مد کے ساتھ بحث کرتے پھرتے ہیں۔

میلے کو

نوچندی کا میلہ شروع ہوئے آج تیسرا دن ہولیا تھا لیکن نصرو کو ابھی تک میلے میں جانے کی چھٹی ہی نہ ملی تھی۔ اتوار کے دن پہلا میلہ تھا مگر اُس سے یہ کہدیا گیا کہ ابھی میلے میں رکھا ہی کیا ہے کہیں جا کر دوسرے تیسرے دن بھرے گا۔ دوسرا دن آیا۔ محلہ کے تمام بچّے پہن اوڑھکر میلے میں گئے اور وہاں سے پیپیاں۔ غبارے۔ اور گیندیں خرید کر لائے۔ لیکن نصرو کو اُس دن بھی فرصت نصیب نہ ہوئی۔ وہ تمام دن میلے کا تصور کرتا رہا اور جلتا کلستا اپنا کام کرتا رہا۔ کبھی برتن دھوتا۔ کبھی جھاڑو دیتا اور کبھی ننھے میاں کے چھوٹے لڑکے کو گود میں لئے بہلاتا پھرتا۔ دو ایک مرتبہ جو وہ سودا سلف لینے بازار گیا تو محلّے کے لڑکوں سے کھڑا کتنی کتنی دیر باتیں کرتا رہا اگرچہ گھر آکر پہلی مرتبہ اُس نے دیر کرنے کی وجہ سے کافی صلواتیں سُنیں اور دوسری بار اُس کی قرار واقعی گوشمالی بھی کی گئی لیکن میلے کا ذکر سُن کر اُسے کچھ ایسی مسرّت سی ہوتی کہ وہ خود پر قابو نہ رکھ سکتا تھا۔ اُس کا جی چاہا کرتا تھا کہ گھنٹوں کھڑا میلے کی باتیں سُنا کرے۔ اور جب اُس نے یہ سُنا کہ مہری نقّال کا لڑکا رفیق، دروازہ کے قریب والے تھیٹر میں کام کر رہا ہے تو اُس کی حیرت اور خوشی

کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اُس نے کئی مرتبہ سوچا کسی بگھی کے پیچھے بیٹھکر کیوں نہ جلدی سے نوچندی ہو آؤں۔ بس ذرا سی دیر میں دروازے ہی سے واپس آجاؤں گا' لیکن بیگم صاحبہ کی غصّہ میں اُبلی ہوئی آنکھوں کا تصور اُس کے ہر میٹھے خیال کو مٹا دیتا۔ وہ بغیر اجازت جانے کا حشر جانتا تھا۔ دوسرے جب اُس نے اپنے گندے پاجامے پر نظر ڈالی جسکا ایک پائینچہ بالکل پھٹ چکا تھا تو اُسے مجبوراً اپنے ارادہ کو ملتوی کرنا ہی پڑا۔ "میرے پاس کوئی پیسہ بھی تو نہیں" اُس نے برف کے بڑے سے ڈلے کو چوستے ہوئے اپنے دل کو بہلانے کے لئے کہا اور دوباری میں اس طرح زور زور سے پیر مارتا ہوا داخل ہوا گویا کہ وہ بھاگا ہوا آیا ہے۔ اور جب بیگم صاحبہ نے مہمانوں کا خیال کر کے اپنے غصّے پر انتہائی قابو رکھتے ہوئے کہا "ارے کہاں مرگیا تھا" تو اُس کے دماغ سے نوچندی۔ بگھی۔ رفیق نقال۔ اور ہنڈولوں کے تصورات یکایک اس طرح رفو چکر ہو گئے جیسے کسی فلم کے جل جانے سے لوگوں کی نظروں سے یکایک تمام مناظر اوجھل ہو جاتے ہیں۔

آج بمشکل تمام خدا خدا کر کے اسے دو ڈھائی بجے چھٹی ملی۔ وہ فوراً بھاگم بھاگ اپنے گھر پہونچا۔ اپنی ماں سے ایک پیسہ لیا اور بہت پھُرتی کے ساتھ نائی کے یہاں پہونچ گیا۔ نائی کو ایک دوسرے شخص کی حجامت بناتے دیکھکر اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ لیکن اُسے مجبوراً بیٹھ کر انتظار کرنا ہی پڑا۔ اس دوران میں وہ برابر ہنڈولوں۔ چکّروں اور ہوائی جہازوں کے متعلق سوچتا رہا۔ حجامت بنواتے وقت کچھ تو اُس نے خود بہت عجلت برتی۔

کچھ نائی کی بے توجہی نتیجہ یہ نکلا کہ اُس کی گُدّھی پر دسیوں بلائیاں پڑگئیں۔ اور جب وہ نل پر نہانے گیا تو اُسے محلّے کے لڑکوں نے خوب ہی توچھیڑا اُسکے چچا کے لڑکے بندو نے تو اُسے "نائی کے بے نائی کے ...." کہ کہکر اسقدر پریشان کیا کہ وہ غریب اچھی طرح نہائے بغیر ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ گھر جاکر اُس نے اپنی ماں سے کپڑے مانگے۔ بغیر کلپ استری کا کرتا پاجامہ پہننے سے پہلے وہ دیر تک روتا رہا۔ وہ دل میں سوچتا "ننھے میاں کے برف سے دُھلے ہوئے کپڑے نہ سہی لیکن ایسے پھٹے پرانے کپڑے تو نہوتے۔" کرتے میں بٹن نہونے پر بھی وہ خوب چیخا چلاّیا۔ اُس کی ماں نے ٹانکے بھرنے چاہے لیکن اُسنے سڑک پر سے پائے ہوئے زنگ آلود سیفٹی پن کو لگانا بہتر سمجھا۔ پن لگاتے لگاتے معاً اُسے کچھ یاد آیا اور وہ بھاگا ہوا محلّے کے بنئے کی دوکان پر پہونچا اور اُس سے لڑ جھگڑ کر تھوڑا سا تیل ہتیلی پر لے ہی لیا۔ بنئے نے سر پر چپت جماتے ہوئے کہا "ابے اس ٹھٹّے سے جائیگا نوچندی" تو تیل کی دو ایک بوندیں اُس کے کپڑوں پر بھی گر گئیں۔ گھر تک پہونچتے پہونچتے وہ بوندیں پھیل پھیل کر بڑے بڑے دھبّے بن گئیں۔ اس بات پر اُسے اتنا طیش آیا کہ گھر میں جاکر اُسنے اپنی ماں سے بندو کی جی بھرکے شکایتیں کیں۔ وہ خود گویا ایسے موقعوں کی تاک میں رہتی تھی ذرا سی شہ پاکر خوب چیخی چلائی۔ اور بندو کی سات پُشت کی خبر لے ڈالی۔

نصرو جب چمار کے ہاں سے اپنے گھٹا ہوا نری کا جوتہ پہن کر میلہ کو چلا تو اُس کی جیب میں کُل تین پیسے تھے۔ اُسے ننھے میاں کے یہاں سے

اکنّی انعام کی ملی تھی اور دو پیسے اُس کی ماں نے دیئے تھے لیکن حجامت بنوانے اور جوتا گھٹوانے میں اُس کی رقم آدھی رہ گئی تھی۔ وہ تمام راستے حساب لگاتا چلا گیا کہ وہ اُسے کس طرح خرچ کریگا۔ منصو میاں، چھوٹے میاں کے بڑے صاحبزادے نے جو نصرو کے ہم عمر تھے گھر میں آکر ہوائی جہاز کی سیر کا ذکر کیا تھا اور نصرو کا جی اُسی وقت سے ہوائی جہاز کی سیر کو بے چین تھا۔ لیکن اُسے معلوم تھا کہ اُس کا ٹکٹ ایک آنہ میں ملتا ہے اور اُس کے پاس صرف تین ہی پیسے تو تھے۔ اگر وہ کسی طرح چار پیسے کر بھی لیتا تو پھر ہنڈولوں میں کیسے جھولتا۔ چکّر میں گھوڑے پر کیسے بیٹھتا۔ اُسی لال زین والے بڑے گھوڑے پر جس پر اُس کے چچا کا لڑکا بندو بیٹھا تھا اور کہتا تھا کہ اور کوئی اُس پر سوار ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر اُسے بڑے اور پکوڑیاں بھی تو کھانی تھیں اور گنڈیریاں بھی۔ اسی سوچ میں چلتا چلتا وہ آخر میلے کے نزدیک والی سڑک پر آن پہونچا۔

سڑک پر تانگوں اور موٹروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ موٹر کے ہارن اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازوں سے ایک شور مچا ہوا تھا لوگ باگ اچھے اچھے ریشمی بھڑک دار کپڑے پہنے تانگوں اور موٹروں میں بیٹھے میلہ کو اُڑے چلے جا رہے تھے اور میلے سے آنے والی گاڑیوں میں بچے بڑے بڑے اُڑنے والے رنگین غبارے لئے بیٹھے تھے۔ نصرو آنے جانیوالوں کو دیکھتا ہوا کیچڑ سے بچ بچ کر سڑک کے ایک طرف چل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر میں بھی امیر ہوتا تو ایک موٹر میں بیٹھ کر میلے کو جاتا اور عبداللہ قصائی کے

بڑے لڑکے کی واسکٹ سے کہیں اچھی واسکٹ بنواتا۔ بوٹ نہیں بلکہ ایک عمدہ سا سلیپر پہنتا اور پھر، پھر میں ہوائی جہاز میں بیٹھتا اور جیسی نان خطائیاں منصور میاں لائے تھے ویسی ہی سیر بھر نان خطائیاں خرید کر لاتا۔ ایک باجہ لیتا اور ایک چابی والی ریل گاڑی خریدتا اور اگر بندو مجھ سے دیکھنے کو بھی مانگتا تو ایسے ہی ڈانٹ دیتا جیسے منصور میاں نے مجھے ڈانٹ دیا تھا۔ پھر اُسے کچھ خیال آیا اور وہ کسی قدر خوش ہو کر دل میں سوچنے لگا " اگر میں کبھی رئیس بن گیا تو میں بندو کو اپنا نوکر بناؤں گا اور اُسے ایسے ہی مارا کروں گا جیسے منصور میاں مجھے مارتے ہیں" اب اُس کے کانوں میں ہنڈولوں چکروں کی چرخ چوں کی آوازیں زور شور کے ساتھ آ رہی تھیں اور اُس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنے پیسوں میں سے ایک نکال بھی لیا تھا۔ دفعتاً اُس کے کانوں میں آواز آئی " ایک پیسہ میں ایک روپیہ کا مال آؤ قسمت والوں کا سودا ہے۔ لٹا دیا۔ جرمن والے نے اپنا مال لٹا دیا۔ ایک پیسہ میں ایک روپیہ کا مال" نصرو کو ایک دم سے خیال آیا کہ منصور میاں کے ایک دوست کو گپ چپ بنڈل میں سے ایک گھڑی ملی تھی۔ یہ سوچتے سوچتے وہ سڑک کے کنارے لگی ہوئی بھیڑ میں کھڑا ہو گیا۔ ایک ٹھیلے میں بہت بنڈل پڑے ہوئے تھے۔ ہر شخص ایک پیسے میں ایک بنڈل اُٹھاتا اور دوکاندار اُس میں سے کچھ نہ کچھ نکال کر اُسے دیدیتا۔ خود نصرو کے سامنے ایک بڑے سے بنڈل میں سے منہ سے بجانے کا باجہ نکلا۔ بس پھر کیا تھا۔ نصرو بیتاب ہو گیا۔ اور اُس نے ایک پیسہ دیکر بنڈل اُٹھا ہی لیا۔ دوکاندار نے اُسے

کھولنا شروع کیا اور نصرو نے دل میں دعائیں مانگنی شروع کردیں۔ بنڈل میں سے صرف ایک ٹین کا چمچہ نکلا۔ دوکاندار نے ہنس کر کہا "یہ ہے اپنی قسمت کا دھنی۔ جا اس چمچہ سے ربڑی کھائیو" نصرو کو بہت ناامیدی ہوئی۔ اُس کے جی میں تو آیا تھا کہ ایک اور بنڈل اُٹھائے لیکن پھر یہ سوچ کر کہ اگر اب کے بھی خالی نکلا تو کیا کروں گا وہ آگے چلدیا۔

اب وہ ہنڈولوں کے بیچ میں کھڑا تھا۔ ایک ہنڈولے والا اپنے بھرے ہوئے ہنڈولے کو جُھلا رہا تھا۔ کبھی ایک خانہ اوپر آتا اور کبھی دوسرا۔ جو خانہ اوپر پہنچ جاتا اُس میں بیٹھے ہوئے لوگ نیچے والوں کو ہنس ہنس کر فخر کے ساتھ دیکھنے لگتے۔ تھوڑی دیر بعد ہنڈولا خالی ہو گیا اور نصرو ایک پیسہ میں دو دفعہ جُھلائے جانے کا وعدہ لیکر بیٹھ گیا۔ ہنڈولا بھرنا شروع ہو گیا۔ جو خانہ بھر جاتا اُسے اوپر کر دیا جاتا اور اوپر کا خالی خانہ نیچے۔ جب نصرو اوپر پہونچ گیا تو وہ بہت خوش ہوا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر میں اتنا لمبا ہو جاؤں تو کتنا اچھا ہو۔ اب وہ میلے چلنے والوں کو اس طرح دیکھ رہا تھا گویا وہ اُن سب سے بڑا تھا۔ اگر بندو آکر مجھے اس وقت دیکھ لے۔" اُس نے اپنے دل میں کہا۔ اور دُور دُور تک نظریں دوڑانے لگا۔ اُس کی نظر میلہ چلنے والوں میں سے کچھ لوگوں پر پڑی اُس نے دیکھا کہ ننھے میاں کوٹ پتلون پہنے ٹائی لگائے چلے آرہے ہیں۔ اُن کے ساتھ منصور میاں بھی ریشمیں اچکن پہنے، ترکی ٹوپی لگائے انگلی پکڑے چلے آرہے تھے۔ نصرو نے اوپر سے غُل مچایا "چھوٹے میاں! چھوٹے میاں!" ننھے میاں اُسے دیکھکر مُسکرائے۔ منصور نے دیکھتے ہی غل مچایا

کہ ہم بھی ہنڈولے میں جھولیں گے۔ لیکن ننھے میاں نے یہ کہکر جھڑک دیا کہ شریف آدمیوں کے بچے ہنڈولے میں نہیں بیٹھا کرتے۔ وہ چلے گئے۔ نصرو دیر تک چھوٹے میاں۔ چھوٹے میاں۔ پکارتا رہا اور منصور مڑ مڑ کر دیکھتا رہا۔ آخرکار وہ میلے میں غائب ہوگئے اور ہنڈولا گھومنا شروع ہوگیا۔

اب نصرو کے پاس صرف ایک ہی پیسہ باقی رہ گیا تھا جسے وہ بار بار اپنی جیب پر ہاتھ پھیر پھیر کر محسوس کرتا جاتا تھا۔ وہ عجب کشمکش و پیچ میں تھا۔ ایک طرف چکر چل رہا تھا اور لال زین والے بڑے گھوڑے پر اسکے برابر کا ایک لڑکا بڑی شان سے بیٹھا ہوا تھا اور دوسری طرف سے آواز آرہی تھی: "قدرت کا عجیب کرشمہ۔ تمام دھڑ سانپ کا اور سر عورت کا ایک پیسہ میں دیکھو"۔ وہ حیران تھا کہ چکر میں بیٹھے یا عورت کو دیکھے جس کا تمام دھڑ سانپ کا تھا۔ لیکن صرف بندو کو چھیڑنے کے لئے اس نے چکر ہی میں بیٹھنا مناسب سمجھا۔ اگرچہ لال زین والے لکڑی کے سفید گھوڑے کی لگام اچھی نہ تھی مگر اسپر سوار ہوکر اسے بڑی خوشی ہوئی۔ جب چکر چلنا شروع ہوا تو نصرو نے اپنے گھوڑے کی باگ کھینچ کر اسے زیادہ تیز دوڑانے کی کوشش کی اسے یقین تھا کہ اس مرتبہ وہ گھوڑا ہمیشہ سے زیادہ تیز دوڑے گا۔ نصرو کو فوراً ہنٹر کا خیال آیا لیکن اب گھوڑا کافی تیز دوڑنے لگا تھا۔ چکر سے جب وہ اترا تو اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اب وہ بے پیسے بے کوڑی گھومنے لگا۔ اسے رہ رہ کر اپنے اوپر غصہ آرہا تھا کہ آخر اس نے بنڈل کیوں کھلوایا۔ چکر میں بیٹھنے کی آخر کیا مصیبت تھی۔ کسی اور دن بیٹھ جاتا۔ کچھ مزا بھی نہ آیا اور پیسہ بھی گیا۔

دہی بڑے والے کی دوکان پر دسیوں بچے بیٹھے ہوئے کھا رہے تھے۔ جلیبیوں والے سے اُسکے محلّے کا ایک لڑکا جلیبیاں خرید رہا تھا۔ اُسے ہر ایک دُکان پر اپنی عمر کے لڑکے کچھ نہ کچھ خریدتے نظر آ رہے تھے۔ ایک کھلونے والے کی دُکان پر وہ دیر تک کھڑا رہا۔ اُس کے دل میں کئی مرتبہ آیا کہ وہ چپکے سے ایک باجہ ہی اُٹھا لے ——— دو آنہ والا باجہ۔ مگر اُس کی ہمّت نہ ہوئی اور جب دُکاندار نے اُسے گھور کر دیکھا تو وہ آگے چل دیا۔ ایک طرف ایک وسیع میدان میں ایک بڑے سے چکّر میں موٹے موٹے تاروں میں چند کشتیاں سی لٹکی ہوئی تھیں جن میں لوگ باگ بیٹھے ہوئے تھے۔ جب وہ تمام کشتیاں بھر گئیں تو انجن چلنا شروع ہوا اور چکّر گھومنے لگا۔ جسقدر چکّر تیزی سے گھومتا تھا اُسی قدر تیزی کے ساتھ وہ کشتیاں بھی گھوم رہی تھیں۔ نصرو بھونچکّا سا کھڑا زمین سے اتنی بلند کشتیوں کو تک رہا تھا۔ کشتیاں اس تیزی کے ساتھ گھوم رہی تھیں۔ کہ نصرو کو اُن میں سے کسی ایک کے ٹوٹ کر دُور جا گرنے کا ڈر ہو گیا۔ انجن بند ہو گیا اور چکّر کی رفتار مدھم پڑنے لگی۔ ایک شخص نے غل مچانا شروع کر دیا "ایک آنہ میں ہوائی جہاز کی سیر ایک آنہ میں"۔ نصرو حسرت کے ساتھ ہوائی جہاز سے اُترنے والے لوگوں کا مُنہ تکنے لگا۔ اُس نے دل میں سوچنا شروع کیا اگر اُسے ایک اکنّی کہیں پڑی پا جائے تو کتنا اچھا ہو۔ اُس نے فوراً اِدھر اُدھر زمین کو اس طرح دیکھنا شروع کر دیا گویا اُس کا کچھ گر گیا تھا۔ وہ میلہ میں سڑکوں پر زمین کو تاکتا پھرنے لگا۔ اگر اِکنّی مل جائے تو میں ہوائی جہاز کی سیر کر لوں۔ لیکن اِکنّی نہیں دونی مل جائے

نہیں۔ نہیں ایک چونّی مل جائے اور یوں ہی سوچتے سوچتے وہ ایک روپیہ تک پہونچ گیا۔ آخر اُس کے محلّہ کے لڑکے گیندا کو بھی تو ایک دن سڑک پر سے ایک روپیہ مل گیا تھا۔ اُس نے دل ہی دل میں دُعائیں مانگنی شروع کر دیں "اے اللہ میاں اگر مجھے ایک روپیہ........ نہیں اٹھنّی........ صرف ایک چونّی مل جائے تو میں مسجد میں چراغی کا ایک پیسہ دوں گا" اُس نے مولوی صاحب کو وعظ میں کہتے سُنا تھا کہ غریب آدمی کی دُعا خدا فوراً قبول کرتا ہے وہ اور بھی گڑگڑا گڑگڑا کر دُعائیں مانگنے لگا۔ یا اللہ میں تیرے نام کی شیرنی بانٹوں گا۔ مجھے صرف ایک چونّی مل جائے میں اپنی عمر میں کبھی کوئی گناہ نہ کروں گا۔ اب میں سودے میں سے کچھ بچاؤں گا بھی نہیں۔ اب میں کبھی چوری سے منصور میاں کا دودھ بھی نہیں پیوں گا۔ اے میرے اچھے اللہ میاں میں تیرا غریب بندہ ہوں (یہ الفاظ اس نے اپنے چچا کو اکثر کہتے سُنے تھے) مجھے صرف ایک چونّی پا جائے۔"

نصرو یوں ہی دُعائیں مانگتا زمین پر نظریں جمائے رات کے دس بجے تک میلے میں پھرتا رہا لیکن اُسے کوئی چونّی نہ ملی۔

بندگی بیچارگی

جمعرات کو پانی پڑتے ٹھیک آٹھ دن ہو لئے تھے پھر بھی ایسا
معلوم ہوتا تھا کہ آسمان کھلنے کا نام نہیں لے گا۔ سورج کا تو ذکر کیا
ہفتہ بھر سے دن کی روشنی بھی گھٹاؤں کی تاریکیوں میں مل ملا کر کاجل
بن گئی تھی۔ مینہ کا یہ حال کہ اب برس کے پھر نہ برسوں۔ ایک گھٹا پورے
طور پر برسنے بھی نہ پاتی تھی کہ دوسری دھواں دھار پانی برساتی ہوئی چلی
آتی۔ گھر گھر میں کنواری بچیاں پانی میں تیل ڈالتی تھیں۔ مسافر کھڑے کئے
جاتے تھے اور طرح طرح کے ٹونے ٹوٹکے ہوتے تھے لیکن آسمان جوں کا توں گھٹاؤں
سے لدا ہوا تھا۔ پانی لگاتار برس رہا تھا۔ نالے ندیوں سے کم نہ تھے اور
ندیاں دریاؤں سے ہمسری کر رہی تھیں۔ ایک اٹھواڑے پہلے جہاں
بھوری بھینس کے گھٹنے تک پانی تھا اب بانسوں چڑھ چکا تھا۔ پیمانے کا
پتھر جو ندی کے پل کے نیچے لگا ہوا تھا قریب قریب غرق ہو چکا تھا اس کا
اوپری حصہ کبھی کبھی لہروں کی حرکت سے سیپی کی مانند چمکتا ہوا نظر
آجاتا تھا۔ کچی سڑکیں پانی کے بہاؤ سے ایسی کٹی تھیں کہ جا بجا گہرے غار
بن گئے تھے اور پختہ سڑکیں بھی جگہ جگہ آمد و رفت کے لئے بیکار ہو گئی تھیں۔
کچے مکانات تو خیر کیچڑ اور گارے کی طرح بہہ ہی رہے تھے مگر سیمنٹ اور

چونے کے بنے ہوئے عالیشان مکانات اور کوٹھیاں بھی ٹپک رہی تھیں۔ دسیوں کچے مکانات گرنے کے بعد جب کسی پختہ اونچے مکان کے گرنے کی خبر مشہور ہوتی تو موسم کے ستائے ہوئے غریب انسان ایک دوسرے سے یہ کہکر اپنے دلوں کو تسلی دے لیا کرتے کہ جب ایسے ایسے قلعے گر رہے ہیں تو ہمارے اِن جھونپڑوں کی کیا حقیقت ہے۔

بجلی چمکی اور گھٹا کی تیرگی کو پہلے سے بھی زیادہ تیز اور خوفناک بنا گئی۔

"لو وہ گری کہیں!" رعد کی کڑک سُن کر صفیہ نے سہم کر کہا۔

"ہاں خوب گرا! سب کچھ ختم کر دے۔ کچھ بچ نہ جائے!" صفیہ کی بہن شمیمہ نے کچھ ایسے طنزیہ بیباکانہ انداز میں آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا گویا اُسے نہ تو اب اللہ میاں کا خوف تھا اور نہ اپنے مکان کے گرنے کا رنج۔

"آپا یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے! دُعا کرو۔ دُعا!" صفیہ نے آخری لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"دُعا؟ اور ایک ہفتے سے یہ تمام خلقت کر کیا رہی ہے۔ اب تک تو سُنی نہیں اور اب سُن لے گا۔" شمیمہ نے ایک تلخ لہجہ میں کہا۔

"آپا ایسی کفر کی باتیں مُنہ سے نہ نکالو۔ جب خدا کی مصلحت اِسی میں ہے تو . . . .

"بھاڑ میں جائے ایسی مصلحت" شمیمہ نے غصہ سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا "کیا سارے جہان کو ختم کر کے چین لیگا!"

"رحم کر پاک بے نیاز رحم کر۔ اپنے مجبور بندوں پر رحم کر" صفیہ نے

آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے اپنے دوپٹے کو پھیلا کر دُعا مانگی۔" نسیم تم بھی دُعا مانگو معصوم کی دُعا بہت جلد قبول ہوتی ہے۔" صفیہ نے اپنے چھوٹے بھائی سے کہا جو خوف اور سردی دونوں کے باعث کھڑا ہوا تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"کرم کر الٰہی طفیلِ محمد ——— رحم کر الٰہی طفیلِ محمد۔" نسیم نے بھولے انداز میں اپنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔

"الٰہی خیر!" شمیمہ نے ایک زور کے دھماکے کے ساتھ کچھ گرنے کی آواز سُنکر بے اختیار کہا۔ "نسیم۔ دیکھیو ذرا جاکر دوباری کی پچھلی دیوار ....
..... نا نا۔ تم مت جانا۔"

اڑ۔ ڑا۔ ڑ۔ ڑ کر کے کچھ گرا۔ اور ہوا کے جھونکے سے نیم کا تنا اور درخت دُہرا ہو گیا۔

"لو وہ گر گئی نہ آخر۔ ہائے اللہ اب ہم کیا کریں!" صفیہ نے دروازہ کی چوکھٹ سے ایک بے جان انداز میں لگتے ہوئے کہا۔ "رحم کر! الٰہ العالمین رحم کر! اپنے حبیب کے صدقے میں رحم کر!"

"اپنی ساری خدائی آج ہی ختم کر دیجیو۔ کل کے لئے کچھ رہ نہ جائے۔ یوں بار بار گرانے سے کیا ہوتا ہے۔ ایک ہی دفعہ سب کچھ گرا ڈال۔ پاپ تو کٹے!" شمیمہ نے انتہائی مایوسی کے عالم میں کہا۔

ایک دم سے صفیہ اندر کے دالان میں بھاگی ہوئی گئی۔

"لو آپا تمام کپڑے خراب ہو گئے! یہ تو دھار بندھ گئی۔" صفیہ نے بہت گھبرا کے ساتھ پلنگ گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"کیوں آپا قیامت کب آئے گی؟" نسیم نے ڈرتے ڈرتے اپنی بڑی بہن سے سوال کیا۔

"اور قیامت کے سر میں کیا سینگ ہوتے ہیں! یہ قیامت نہیں ہے تو اور ہے کیا؟ آج آٹھ دن ہونے کو آئے اور سورج نکلنے کا نام نہیں لیتا۔" شمیمہ نے صفیہ کو سلائی دیتے ہوئے کہا۔

"مگر بارش کی دعا بھی تو تم نے ہی مانگی تھی اور چھوٹی آپا نے بھی۔" نسیم نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"یہی ناکہ اتنا برسائیو کہ سارا جہان غرق ہو جائے —— تمام چھتیں چھلنی ہو جائیں۔ دیواریں گر جائیں اور کچھ بھی نہ رہے۔" شمیمہ نے ایک خندۂ استہزا کے ساتھ کہا۔

"وہ گری! پھر گری کوئی دیوار۔ قریب ہی گری ہے کہیں" کچھ سن کر

"ہاں وہ شور مچ رہا ہے۔ ضرور چوک میں گری۔ ارے کہیں بیچاری فہیمن کا مکان نہ گرا ہو۔ اللہ میاں اُس بیوہ کا کون بیٹھا ہے!" صفیہ نے گڑگڑاتے ہوئے کہا

اری بیوقوف وہ پہلے مارتا ہی اُنہیں ہے جن کا کوئی آسرا نہیں ہوتا —— بھلا کوئی کوٹھی بھی ایسی ٹپک رہی ہوگی جیسا یہ ہمارا گھروا؟ گریں گے تو کچے کوٹھے۔ ٹوٹے جھونپڑے۔ پرانے کھنڈر مکان۔ نئے نئے پختہ عالیشان مکان کا ہیکو گرنے لگے تھے۔ امیر کا اگر نقصان بھی ہو تو اکیلا نہیں ہوتا۔ ایک آدھ غریب کی بھینٹ ضرور لیتا ہے۔ داروغہ جی کی دیوار گری بھی تو بیچارے ہولا کی چھت پر۔

اب وہ بھلا کیسے بننے لگی ـــــ ہاں داروغہ جی جب چاہیں ایسی ایسی دس دیواریں اور کھڑی کردیں۔" شمیمہ نے ایک عجیب فلسفیانہ سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ گویا وہ جو کچھ کہہ رہی تھی سب سچ تھا اور اُسے اُس کے صحیح ہونے کا کامل یقین تھا۔

"تو تمہارے نزدیک مولا کی چھت بھی اللہ میاں نے گرائی ہے؟"۔ صفیہ نے اپنی بڑی بہن کی نامناسب باتوں سے تنگ آکر کہا۔

"نہیں تو کیا میں نے گرائی ہے؟" شمیمہ نے اپنی مسکراہٹ کو روکتے ہوئے کہا۔ "بارش ہو۔ کھیتی لہلہائے۔ ستاسماں ہو تو سب کچھ اللہ کا کیا ہوا اور طوفان آئیں۔ سیلاب اُمڈیں۔ بستیاں بہیں اور کال پڑیں تو وہ کس کا کام؟

"مگر وہ اپنی مخلوق کو مارتا نہیں۔" صفیہ نے ایک نہایت معصوم شدت یقین کے ساتھ کہا۔

"ہاں امیروں کو مارنا اُس کے بس کا نہیں۔ البتہ غریبوں کو پامال کرنے میں کوئی کسر اُٹھا کر نہیں رکھتا۔" شمیمہ نے نہایت تلخ لہجہ میں کہا۔

"بتا تو ہی بتا ہیضے میں زیادہ کون مرتے ہیں! غریب یا امیر۔ وہ جنہیں ڈاکٹر تو ڈاکٹر دو بوند دوا بھی میسّر نہیں ہوتی یا وہ جو منٹوں میں سینکڑوں خرچ کرڈالیں؟ ہم تو کہتے ہیں اللہ کرے یہ سب امیر مرجائیں اور اُن کا خدا بھی۔" شمیمہ نے اپنی آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو پیتے ہوئے کہا۔

شمیمہ کا جوش کچھ تو اُس کے آخری جملے نے ٹھنڈا کردیا اور کچھ اُن آنسوؤں نے

جو ضبط کرنے کے باوجود اُس کے رخساروں پر ڈھلک آئے تھے۔

بجلی پھر زور سے چمکی اور بارش جو نسبتاً کچھ کم ہو گئی تھی پھر موسلادھار برسنے لگی۔ نسیم صفیہ سے چمٹ گیا گویا وہ اپنی بے دین اور ملحد بہن سے زیادہ اپنی دیندار بہن سے محبت کرتا ہے۔

ہندوستان میں طبقاتی تقسیم

ہندوستان میں انسانوں کو اُن کی معاشری حیثیت کی مطابقت سے قدیم ایام ہی میں چار ورنوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا جو بدستور اس بیسویں صدی میں بھی پائے جاتے ہیں اور برہمن، چھتری، ویش اور شودر کے ناموں سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ اس کے بعد بھی حضرتِ انسان نے اپنی قسامی کے شغل کو ترک نہیں فرمایا۔ اسے جاری رکھا اور کچھ اس خوبی کے ساتھ کہ ایک ایک ذات سے ہزار ہزار ذاتیں بنا ڈالیں اور ہر نسل اور گروہ کے افراد کو لاتعداد حصّوں میں منقسم کر دیا۔

ہندوستان میں مسلمان آئے ایک بالکل جُداگانہ نظام معاشرت لیکر اُخوّت اور مساوات کے راگ گاتے ہوئے۔ ہندوستان کے قدیم باشندوں کو مسلمانوں کو اپنانے میں سخت دُشواریاں پیش آئیں۔ انہوں نے کبھی اعتراف شکست نہیں کیا اور بدھوں۔ جینیوں اور سکھوں وغیرہ کی مانند خود کو ہندو کہلانا گوارا نہ کیا لیکن ہاں یہ ضرور ماننا پڑیگا کہ ہندوستان میں آکر یہ اُس مساوات اور اخوّت کے نغمہ کو بھول کر لگے تقسیم کا راگ الاپنے اور دیکھا دیکھی پڑوسن سیکھے کے مصداق اُنہوں نے بھی اونچ نیچ، رذیل اور شریف کے عنوانات قائم کر کے اپنے اندر ایسی تقسیم کی کہ دوسری قومیں بھی حیران و

ششدر رہ گئیں اور اُن کی اس دانشمندی کی تو داد دینی ہی پڑے گی کہ انہوں نے اقتصادی طور پر گرے ہوئے مسلمانوں کو کمین بھی بنایا اور رذیل بھی ٹھرایا لیکن اُن کو برملا اچھوت اور چانڈال کبھی نہ کہا بلکہ کچھ گنجائش چھوڑیں اور بوقتِ ضرورت اُنہیں اپنا بھائی کہکر اپنے مساوات کے دعوے کو جھوٹا نہ ہونے دیا۔ غریب اور نادار مسلمانوں کی معاشی اور معاشرتی حیثیات بار بار اِس ظاہرداری کے خلاف زبانِ حال سے صدائے احتجاج بلند کرتی رہیں اور کہتی رہیں۔ ع ۔ یہ مہر ہے بے مہریٔ دنیا کا پردہ ۔ لیکن مسلمانوں کے اونچے طبقوں نے ہمیشہ لفظی تسلیوں سے اِن آوازوں کو دبا دیا۔

موجودہ دَور میں لوگوں کی معاشرتی اور سوشل حالت کا تعین عام طور پر اُن کی اقتصادی کیفیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا جاتا ہے ۔ چنانچہ تمام روئے زمین کی آبادی تین تین گروہوں میں تقسیم ہو کر طبقۂ اعلیٰ، طبقۂ اوسط اور طبقۂ ادنیٰ کے دائروں میں سمٹ آتی ہے ۔ ان میں سے بھی ہر ایک طبقے کے دو دو حصّے کیئے جا سکتے ہیں، ہر حصّے کے افراد پر اُن کی اقتصادی حالت کچھ اس طرح اثر انداز ہوتی ہے کہ اُن کی معاشرتی اور تمدنی زندگی نمایاں خصوصیات کی حامل ہو جاتی ہے، اِن خصوصیات کے ذریعے سے اُن کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے خط و خال کافی اُبھر آتے ہیں اور وہ بیک نظر پہچان لئے جاتے ہیں کہ کس طبقے سے اور اُس کے کس حصّے سے متعلق ہیں۔ چنانچہ ہم ذیل میں مختلف طبقات کی مخصوص صفات کو ظاہر کرتے ہیں۔

طبقۂ اعلیٰ کا امتیازی وصف "حکومت" ہے ۔ اِس طبقے کے پہلے حصّے میں

اِس "جبینِ ارض کے داغ" ہندوستان کی آبادی کا وہ حصّہ آجاتا ہے جو زیادہ تر حکمرانوں پر مشتمل ہے۔ ریاستوں کے فرماں روا مع اپنے قریبی اعزا کے اس طبقہ کا جوہر کہلائے جا سکتے ہیں۔ یہ سب کے سب اپنی زندگی کے اعتبار سے کچھ ایسے تیوروں کے حامل ہیں کہ معمولی استطاعت رکھنے والا انسان اِن کے بارے میں کوئی صحیح رائے قائم ہی نہیں کر سکتا۔ اِن کے اعزاز و مراتب کو نمایاں کرنے والا جو سازو سامان منظرِ عام پر آتا ہے اُسے دیکھ کر عوام الناس اس درجہ مبہوت ہو جاتے ہیں کہ وہ غریب اپنے منہ سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔ غلامانہ ذہنیت رکھنے والے بے عمل اور بے روح انسان اِس طبقہ کے ہر فرد کی مدح سرائی میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں اور اپنی نمک خواری اور وفاداری کا ثبوت بہم پہونچانے کے لئے ایسے ایسے فلسفے تراشتے ہیں جنکی رو سے اُن کے آقاؤں کا مرتبہ فلک الافلاک سے بھی اعلیٰ و ارفع ہو جاتا ہے یہ لوگ اپنے خداوندانِ نعمت کی شان میں جب قصیدے لکھتے ہیں تو بال سے بھی زیادہ باریک نکتوں کے ذریعہ یہ بات عیاں کر ہی دیتے ہیں کہ خدا کا نام تو فقط اک ہلکا سا پردہ ہے ورنہ درحقیقت خدائی انہیں کے اختیار میں ہے۔ اِن کے برخلاف ایک گروہ اُن سرپھرے انسانوں کا بھی ہے جن کے سینوں میں اس حکومتی طبقے کی زندگی کے رنگین اور دل فریب تل طور دیکھکر رشک و حسد کی بے پناہ آگ بھڑکتی رہتی ہے اور جن کے متعلق ابلیس اپنے مشیروں سے اکثر کہا کرتا ہے۔ ؎

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ مو

ان حکمرانوں کی حیثیت جن میں دیسی کے علاوہ بڑی بڑی بدیشی حکمران بھی شامل ہو جاتے ہیں اُن لوگوں کے نزدیک جو بات بات میں مقدر کا رونا رویا کرتے ہیں۔ کسی دیوتا، اوتار، اور خدا سے ہرگز کم نہیں ہوتی بلکہ خدا کے وجود اور احکامات کو تو یہ لوگ بسا اوقات نظر انداز کر بھی دیتے ہیں لیکن ان کے وجود اور ان کے احکامات کو نظر انداز کرنا ہرگز کسی کے بس کا کام نہیں ہے۔ اِن حکمرانوں کا ایک امتیازی صفت "مطلق العنانی" ہے اور اِس کی آسودگی کی خاطر اس طبقے کے افراد ہزاروں کیا بلکہ لاکھوں انسانوں کے حقوق کو پامال کرنے میں بھی مطلق باک محسوس نہیں کرتے۔ ان کی بلا سے کچھ ہو انہیں اپنے حلوے مانڈے سے غرض ہوتی ہے۔ ان کی من مانی حرکتیں نہیں رُک سکتیں خواہ سماج چیخے اور مذہب و معاشرت کے سینے پر آرے چلیں۔ ان میں سے قریب قریب ہر ایک کسی نہ کسی مذہب کا پیرو ہوتا ہے اور اگرچہ یہ لوگ روحانیئن کے گروہ سے جو ان پر ازل سے بلا کی طرح مسلّط ہے گھبراتے رہتے ہیں اور اُن کی عائد کردہ بندشوں کو ہمیشہ توڑنے کی فکر میں رہا کرتے ہیں لیکن پھر بھی مذہبی پیشواؤں کو اپنی مٹھی میں رکھنا اور اُن کی طرح طرح سے دل جمعی اور خاطر تواضع کرنا ان کا شعار ہوتا ہے۔ نتیجتاً انہیں مذہب کے سایہ میں پناہ مل جاتی ہے اور جب کبھی ان کے کانوں میں اِس قسم کی کوئی بھنک پڑتی ہے۔ سہ

اُٹھو مری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو ۔۔۔ کاخِ اُمرا کے در و دیوار گرا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے ۔۔۔ کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو (اقبال)

یہ انہیں پروردہ مذہبی پیشواؤں کو بطور سپر سامنے کر دیتے ہیں۔ جب کبھی جمہور آزادی کا تصور اپنے سامنے رکھتے ہوئے زندگی کے ذرائع پر اپنا حق جتانے لگتے ہیں یہ فوراً مولوی کی زبانی "مشیت الہیٰ" کا نغمۂ بے صدا سُنا کر غریب اور بھوکی مخلوق کے سامنے چند بے معنی حقوق اس طرح پھینک کے مطمئن ہو جاتے ہیں جیسے بھوکے کُتّے کو ہڈّی ڈال دی جاتی ہے اور "دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ" کہکر یہ پھر اپنی اپنی رنگ رلیوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

اس طبقہ کے انسانوں کے سامنے ابتدا ہی سے زندگی کی تمام سہولیتوں اور آسانیوں کا انبار لگا دیا جاتا ہے دُنیا کی وہ تمام نعمتیں جو انسانی تصور میں آسکتی ہیں انہیں بغیر مانگے مہیّا کر دی جاتی ہیں۔ انہیں یا تو یوروپ اور امریکہ کی مشہور ترین یونیورسٹیوں میں ایک امتیازی شان کے ساتھ تعلیم دی جاتی ہے ورنہ ہندوستان ہی میں دُنیا کے تمام ماہرین علم و فن ان کے روبرو آکر زانوئے ادب تہ کرنا اپنا فرض سمجھ لیتے ہیں۔ انہیں اگر زکام ہوتا ہے تو مشہور زمانہ ڈاکٹر طلب کئے جاتے ہیں اور اگر خدانخواستہ انکی بدکرداریاں رنگ لاتی ہیں اور ان کی صحت زیادہ عیاشیوں کی ضامن نہیں بنتی تو پھر کشمیر اور سوئزرلینڈ کی جنّت نظر وادیاں انھیں اپنے آغوشِ اُلفت میں لیکر پہلے سے بھی زیادہ مضبوط اور قوی بنا کر چھوڑ دیتی ہیں۔

ان ہستیوں کے سامنے ہر انسان کو سجدہ کرنا پڑتا ہے خواہ وہ مسجد اور مندر میں سجدہ کرنا گوارا نہ کرتا ہو۔ خدا کی یہ برگزیدہ مخلوق۔ یہ پیارے بندے جب کبھی ایک جگہ سے دوسری جگہ انتقال فرماتے ہیں تو انکے قدوم میمنت لزوم

کی آمد کا اعلان فوراً توپوں کی ضربوں سے کیا جاتا ہے۔ اِن انسانوں کے قبضہ میں دُنیا کی وہ سب سے بڑی قوت ہے جسے کسی نے عین مجبوری کے عالم میں۔ ع "ستّارِ عیوب و قاضی الحاجات" کہکے بے اختیار پکارا تھا۔

یہ طبقہ یوں تو ازل سے چلا آرہا ہے لیکن زمانۂ وسطیٰ میں اِس کے جو ٹھاٹھ رہے ہیں اُس کا تصور بھی بیسویں صدی کے انسان کے بس کا نہیں ہے۔ اِن کے تعیش کی رنگینیوں اور نظر فریبیوں کے مناظر دیکھنے کے لئے ہمیں اپنی چشم تصور کو اتنا بیباک ضرور بنانا پڑیگا کہ وہ حرم سراؤں میں بہنے والے حُسن و شباب کے دریاؤں کی موجوں کو حریصانہ طور پر دیکھ سکے۔ اِس طبقہ کے افراد بیداریٔ جمہور کی بدولت دُنیا میں دن پر دن کم ہوتے جارہے ہیں لیکن ہندوستان نے اِس نوع کی بقا کا گویا ذمّہ لے لیا ہے

جس طرح سائنسداں نیوٹن کے نظریۂ "کشش" اور البرٹ انشائن کے نظریۂ اضافیت کو چراغ راہ سمجھتے ہیں اور جیسے نیچریوں کے نزدیک ڈاروِن کا نظریۂ "ارتقاء" قابل قبول ہے بالکل اسی طرح اِس طبقہ کے افراد نظریۂ "ظلم" پر کامل اعتقاد رکھتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہوئے۔ ؎

تقدیر کے حاکم کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

مجبور و کمزور انسانوں کو اپنے ظلم و جبر کے پیروں تلے۔ چیونٹیوں کی مانند روندا کرتے ہیں۔ یہ طبقہ اگرچہ بلحاظ آبادی آٹے میں نمک کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن جس طرح آٹے پر نمک کے اثرات غالب ہوتے ہیں اسی طرح یہ بھی ہندوستان

کی تمام آبادی پر چھائے ہوتے ہیں۔

اس طبقہ کا دوسرا حصہ اگرچہ اپنی صفات اور طبقاتی خصوصیات کے اعتبار سے اُسی حکمران نوع سے مشابہ ہے لیکن اس طبقہ کے افراد میں مطلق العنانی کی کمی ہے انہیں حکومتی طبقہ کی مانند (Divine Rights) خدائی حقوق نہیں پہونچتے بلکہ ان میں سے بیشتر کو حکومتی طبقہ خود کو فرائض کے بارے سبکدوش کرنے کے لئے اختیارات سونپ دیتا ہے۔ عمال حکومت اس طبقہ کی خاص پیداوار ہیں لیکن ان کے علاوہ چھوٹی موٹی ریاستوں کے مالک، تعلقہ دار، جاگیردار، بڑے بڑے سیٹھ ساہوکار، ملوں کے مالک اور چوٹی کے رہنما بھی اسی طبقہ میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ سیٹھ ساہوکار، تعلقدار، ملوں کے اور بڑی بڑی فرموں کے مالک یہ سب لاکھوں انسانوں پر حکومت کرتے ہیں اور اُن کے پیٹ کاٹنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان کے لاتعداد حقوق کی حفاظت اور پاسداری عمال حکومت کے ذمہ ہوتی ہے۔ یہ حکومت کے لاڈلے فرزند ہوتے ہیں اور ان کی شرارتوں سے حکومت ہمیشہ چشم پوشی کیا کرتی ہے یہ بھی حکومت پر آڑے وقتوں میں اپنی دولت نثار کر دیتے ہیں۔ قوموں کے رہنما جو زیادہ تر طبقۂ وسطیٰ سے اُبھر کر جمہور کی مجموعی طاقت سے اپنے دست و بازو مضبوط بنا کر آتے ہیں اس طبقہ کے افراد میں اتھل پتھل سی پیدا کر دیتے ہیں۔ عمال حکومت قانون بناتے ہیں اور یہ قانون توڑتے ہیں یہ اپنی دریدہ دہنی اور بیباکی کی بدولت حکومت کی نظروں میں ہمیشہ کانٹے کی طرح کھٹکتے رہتے ہیں۔ ان کی مالی حیثیت اگرچہ بہت بلند نہیں ہوتی لیکن

ان کے اثر کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ محض اپنی جنبش ابرو سے یہ اپنے سامنے خزانوں کے ڈھیر لگا سکتے ہیں۔ چند اعتبارات سے یہ گروہ حکومتی طبقہ سے بھی بازی لے گیا ہے۔ ان کی نقل و حرکت انسانوں میں ایک عجیب ہیجان پیدا کر دیتی۔ غیر توپوں کی سلامی سے تو یہ محروم رہتے ہیں لیکن انہیں دیکھکر عوام پر ایسی مجنونانہ کیفیات طاری ہوتی ہیں کہ وہ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھالیا کرتے ہیں۔ چونکہ حکومت کے سکون و اطمینان میں یہ شور و شغب بہت خلل اندازیاں کرتا ہے اس لئے حکومتی طبقہ اس کے محرکین کو اکثر و بیشتر جیل کی چہار دیواریوں میں مقید کر دیتا ہے۔ لیکن یہ ان کے اپنے قابو کی بات نہیں ہے۔ ان کی صورت شکل لیڈری کرتے کرتے کچھ ایسی عجیب و غریب ہو جاتی ہے ان کی حرکات اس قدر عقل کو خیرہ کرنے والی ہوتی ہیں کہ عوام انہیں دیکھکر مجبوراً اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ یہ لوگ چار آنہ گز کے کپڑے میں ملبوس ہوتے ہوئے بھی۔ بلکہ برہنگی کے عالم میں بھی حکومتی طبقہ کے افراد سے بازی لے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض حضرات اپنی غیر معمولی قابلیت کے طفیل ایک تیر سے دو شکار کر لیتے ہیں۔ اگر ایک جانب عوام کو اپنی گرفت میں کرکے مطمئن کرتے رہتے ہیں تو دوسری جانب حکومت کو بھی خود سے بدظن نہیں ہونے دیتے اور دونوں کی عقیدت اور کرم کے باعث پھولتے پھلتے رہتے ہیں۔

اس طبقہ کے لوگوں کو مذہب سے یا تو بیحد لگاؤ ہوتا ہے اور اس کے باعث یہ عوام کے نزدیک عام انسانوں کی حدود سے گذر کر خاص انسانوں کو

پس پشت ڈالتے ہوئے اوتاروں کی بلندیوں پر فائز ہو جاتے ہیں یا بالکل بہا دیا سا تعلق ہوتا ہے اور مذہب کو بطور آڑ کے استعمال کیا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ سے اس گروہ میں ایسے افراد بھی شامل ہونے لگے ہیں جو مذہب کو ایک سرے سے مانتے ہی نہیں اور خود کو آسمانی نہیں بلکہ زمینی مخلوق ہی بتاتے ہیں لیکن ان کی سُننے والے ابھی زیادہ تعداد میں نہیں پائے جاتے۔ ان نئے انسانو سے حکومت حد درجہ خائف رہتی ہے کیونکہ یہ بالا علان قصرِ زر داری کی بیخ و بُنیاد اکھاڑ پھینکنے کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ ان کے دل میں تمام جہان کا درد ہوتا ہے لیکن ان کا جہاں صرف سرمایہ داری، حکومت اور شہریاری کے بار سے دبے ہوئے انسانوں سے آباد ہے ان کے نزدیک بے سرو سامان انسانوں کو پامال کرنے والے افراد ہرگز انسان کہلانے کے مستحق نہیں ہوتے بلکہ وہ درندے، وحشی اور خونی ہوتے ہیں۔ ان کی دریدہ دہنی کو بند کرنے کے لئے حکومت ہر قسم کے حربے بے تکلف استعمال کرتی ہے لیکن یہ تمام پابندیوں اور سختیوں کے باوجود کرتے وہی ہیں جو ان کے دماغ میں بیٹھ جاتا ہے۔ طبقۂ اعلیٰ کے افراد کی اقامت گاہیں ہمیشہ مرجع انام بنی رہتی ہیں کہیں تو ضرورتمندوں کے گروہ منڈلاتے نظر آتے ہیں اور کہیں عقیدتمندوں کے انبوہ دکھائی دیتے ہیں۔

اس طبقہ کے بعد درمیانی طبقہ آتا ہے۔ اسے بھی دو حصّوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے ایک (Upper middle Class) درمیانی اوپری طبقہ کہلاتا ہے اور دوسرا درمیانی نچلے طبقہ (lower middle Class) کے نام

سے مشہور ہے۔ پہلے درجہ کی مخصوص کیفیت خوش حالی اور فارغ البالی ہے اور اس میں تمام مطمئن اور شکم سیر لوگ آجاتے ہیں۔ دوسرے درجہ میں معمولی استطاعت کے وہ پریشان حال، معاشی الجھنوں کے شکار انسان شمار ہوتے ہیں جنہیں شرفا کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

درمیانی طبقے کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اسمیں بے پناہ کشمکش پائی جاتی ہے۔ یہ کشمکش اُس تخلیقی قوت کا نتیجہ ہے جو اس طبقے کے افراد میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ یہی طبقہ اپنے کچھ افراد کو اُبھار کر طبقۂ اعلیٰ میں قسمت آزمائی کے لئے بھیجتا رہتا ہے اور یہی کچھ کو گرا کر مادۂ فاسد کی طرح طبقۂ اسفل کی پستیوں میں پھینک دیتا ہے۔ اس طبقہ میں آمد و رفت کا یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ طبقۂ اعلیٰ کے افراد اتفاقات کی ستم ظریفیوں کے ہاتھوں اس طبقے میں آن پھنستے ہیں اور یہ بھی ہوتا ہے کہ طبقۂ اسفل کے انسان زندگی کے کسی نہ کسی ذریعہ پر قابو پاکر اس طبقے میں آن دھمکتے ہیں۔ اس طبقے کی ہماہمی کی بدولت دُنیا کے بیشتر ملکوں میں ہنگامے برپا رہتے ہیں اور یہی طبقہ اس "زندہ مردوں کی بستی" ہندوستان کی روح ہے۔

کسی مُلک اور قوم کی تہذیب اور معاشرت، مذہب اور تمدن محض اُس کے درمیانی طبقے کے مطالعہ سے کماحقہٗ معلوم ہوسکتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی یہی جماعت ہمارے مُلک کی ہر حیثیت کی نمائندگی پورے طور پر کردیتی ہے۔ اس طبقے میں ہم انسانیت کی ایسی مختلف النوع تصویریں

دیکھیں گے جو اور کسی طبقے میں نہیں مل سکتیں۔ ہمارے ملک کے تمام قدیم و جدید مذاہب کے ماننے والے اور اُن کے پھیلانے والے، ہمارے ملک کی مختلف زبانوں اور معاشرتوں کو سنوارنے اور منظرِ عام پر لانے والے۔ ملک کی شعریت اور لطافت کے مظہر اس کی بےحسی اور جہالت کے پیکر، اسکی کھنگی اور قدامت کی پاسبانی کرنے والے اور باوا آدم کے زمانے کی قدروں کو سراہنے والے بلکہ اُن کی خاطر اپنی آزادی اور غیرت وحمیت کو قربان کردینے والے سب کے سب اسی طبقے کی پیداوار ہیں۔ اسی طبقے کی زرخیزیوں کی بدولت نئے نئے تخیلات اور تصورات کے حامی اور اُن کی نشرو اشاعت کے ساعی بھی ہمیں نظر آجاتے ہیں۔ یہی طبقہ شاعر پیدا کرتا ہے اور یہی طبقہ عالم و فاضل بناتا ہے۔ اسی سے لیڈر بھی معرض وجود میں آکر اپنی ارتقائی منازل طے کرتے ہیں اور یہیں سے مذہب کے ٹھیکیدار نام نہاد علماء اور ودوان بھی اپنی ہستیوں کو نمایاں کرتے ہیں۔ یہی زمینداروں کے گروہ کے گروہ منظرِ عام پر لاتا ہے اور یہی سرمایہ داروں کے جتھے کے جتھے دکھلاتا ہے۔

دُنیائے انسانیت کی تمام مکروہات اور خرافات اور تمام اوصاف اور بلندیاں اس طبقے کے افراد کے دلوں اور دماغوں میں رستی بستی ہیں۔ یہی طبقہ اگر قدامت پسند ہوتا ہے جیسا کہ ہندوستان میں ہے تو ملک جہالتوں کا شکار ہو جاتا ہے اور قوموں کو ایک انچ ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہونا دُشوار ہو جاتا ہے اور اگر اس طبقے کے رجحانات ترقی پسندی کی جانب مائل ہوتے ہیں تو سماج کے جسم میں بھی شادابی کی رُوح دوڑ جاتی ہے اور قومیں ہوا کے

گھوڑوں پر سوار ہو کر منازلِ ارتقا کی طے کرتی نظر آیا کرتی ہیں۔

اس طبقے کی بود و باش زیادہ تر شہروں میں رہتی ہے۔ شہر کے پُرفضا اور شاداب علاقوں میں بنی ہوئی شاندار اور دیدہ زیب کوٹھیاں درمیانی اوپری طبقے کی خوش حالی کی دلیل ہیں اور شہر کی گنجان آبادی کا دارومدار درمیانی نچلے درجے کے افراد پر ہے۔ شہروں کی رونق اور چہل پہل تو اس طبقے کے دم قدم سے ہی ہے لیکن دیہات اور قصبات بھی اس سے قطعی طور پر محروم نہیں ہیں۔ دیہات میں چھوٹے چھوٹے مٹی اور پھوس کے جھونپڑوں سے فضاؤں میں سربلند کئے ہوئے مکانات اس طبقے کی برتری کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔

ہمارے مُلک کی تمام سیاسی ہنگامہ آرائیاں، فرقہ وارانہ فسادات، مذہبی چیخ و پکار اسی طبقے کے نچلے افراد کی شرمندۂ احسان ہیں۔ اسی میں وہ ہستیاں زیادہ سے زیادہ تعداد میں پائی جاتی ہیں جو مجبور و بیکس انسانوں کے زندہ رہنے کے حقوق پر جابرانہ قبضہ رکھنا اپنا پیدائشی اور مذہبی فرض سمجھتی ہیں اور اسی طبقے میں رجعت پسندی اور قدامت کو ٹھکرانے والے انسان بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اس طبقے کے ادنیٰ گروہ کے لاکھوں انسان بھیڑ بکریوں کے گلّوں کی طرح دفتروں میں آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں اور اسی طبقے کے اعلیٰ درجہ کے افراد آئی۔ سی۔ ایس اور پی۔ سی۔ ایس کی شاندار ملازمتوں پر فائض ہو کر انسانیت کے جملہ فرائض سے جی چُرانے لگتے ہیں۔ اسی جماعت سے وہ نورانی انسان اُبھرتے ہیں جن کے

چہرے بقول جوش خدا کے خوف سے "گل تر" بنے رہتے ہیں اور جن کے تن و توش کو دیکھکر یہ مصرع زبان پر آجاتا ہے۔ ع۔ "پھولے شکم عریض سینو والو" اور اسی میں زندگی کا دکھ درد سہنے والے وہ پریشان خیال اور خستہ حال انسان ہیں جو زہد ریائی سے بدمستی کو لاکھ درجہ بہتر سمجھتے ہیں۔

یہ طبقہ کبھی ہنگاموں سے خالی نہیں رہتا۔ ہمارے بدقسمت ملک کی تھوڑی بہت رونق بھی اسی طبقے سے قائم ہے لیکن یہ طبقہ ترقی پسند ہونے کے بجائے انحطاط اور زوال پر قانع نظر آتا ہے اور زندگی کی تلخ اور بین حقیقتوں سے جان بچاتا ہوا پھرتا ہے ترقی پسندی کا عنصر آہستہ آہستہ اس گروہ میں سرایت کرتا جاتا ہے۔

اس طبقے کے سب سے زیادہ باا ثر انسان ، جرنلسٹ ، ادیب اور لیڈر کے ناموں سے یاد کیئے جاتے ہیں۔ یہ انسان زیادہ تر بہ خود غلط ہوتے ہیں چونکہ خود زعم باطل کا شکار ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی پیہم کوشش یہی ہوتی ہے کہ عوام کو بھی فریبوں کا شکار بناتے رہیں۔ ان میں سے اکثر بندگی کے روپ میں خدائی کے دعوے کیا کرتے ہیں۔ ان کی اصلاح خود انہیں کی مشیت پر موقوف ہے۔ ہندوستان کی موت و حیات ، جمود و ترقی کی ذمہ داری اسی گروہ پر عائد ہوتی ہے دیکھیئے اسمیں کب اپنے فرائض کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

اب آتا ہے ہندوستان کا وہ طبقہ جن کی بدولت ایک ہندوستانی کی حیثیت مہذب اقوام کے نزدیک محض ایک قلی کی ہو کر رہ گئی ہے۔ اسمیں ہمارے ملک کے تمام مظلوم و مجبور محنتی اور فاقہ کش ، جاہل اور بے سر و سامان

انسان آ جاتے ہیں۔ ہندوستان کی نوے فیصدی آبادی انہیں انسانوں پر مشتمل ہے۔ اس طبقے میں بھی کافی تقسیم موجود ہے لیکن دو گروہ بالکل واضح طور پر نظر آجاتے ہیں۔

پہلے گروہ میں اس ملک کی وہ آبادی آجاتی ہے جسے ہم اچھوت کہہ کر پکارتے ہیں۔ قدامت پسند انسان جب ہزاروں سال قبل کے ہندوستان کا فخریہ ذکر کیا کرتے ہیں اور جب ہندوستان کی تہذیب و تمدن کو اپنا منتہا ٹھہراتے ہیں۔ اس ملک سے پانچ کروڑ اچھوت اُسی مہذب اور سنہرے دور کی جیتی جاگتی نشانی ہیں۔ شاید روئے زمین پر انسانیت اس درجہ حقیر اور ذلیل کہیں نہ ہوئی ہوگی جس طرح ہمارے ملک میں اچھوت بن کر ہوئی ہے۔ پراچین ہندوستان میں اس بدبخت گروہ کی جو درگت ہوئی ہے اُسے سُن کر ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اچھوت کے سایہ سے تو بھاگنے والے دھارمک انسان اب بھی کروڑوں کی تعداد میں مل جائیں گے لیکن اپنے اختیارات کے زمانہ میں یہی انسان اگر سُن لیتے تھے کہ کسی اچھوت کے کانوں میں سنسکرت کا کوئی شبد پہونچ گیا ہو تو اُسکے کانوں میں پگھلا ہوا گرم سیسہ ڈالدیا جاتا تھا۔ ان پر زندگی کی تمام نعمتیں یہاں تک کہ زمین اور پانی بھی حرام کردئے گئے تھے جن سڑکوں پر اونچی ذات کے لوگ چلتے تھے وہ ان کیلئے بند تھیں جن کنوؤں سے وہ اپنی پیاس بجھاتے تھے اُن کا ایک قطرہ بھی پینا ان کے لئے ایک جرم عظیم سمجھا جاتا تھا۔ غرض ان کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا جاتا تھا جو حیوانوں کے ساتھ بھی نہیں ہوتا اور تا حال وہ اُسی طرح موجود ہے۔ مذہب اور سوسائٹی کا ٹھکرایا ہوا اور روندا ہوا یہ گروہ

ہزارہا سال کے مصائب برداشت کرنے کے باوجود ابھی تک موجود ہے اور ہندوستان کی اجتماعی زندگی کا سب سے بڑا اور مہلک روگ بنا ہوا ہے۔ ان لوگوں میں احساس پستی اُس انتہا پر پہونچ گیا ہے کہ اُس کے دور کرنے کے لیئے صدیاں درکار ہیں۔ ان کے دلوں میں یہ بات جاگزیں کر دی گئی ہے کہ تمہاری تخلیق کا منشاء ہی یہ ہے کہ ہمیشہ خوار و زبوں رہو۔ اس طبقہ کی مصروفیات اونچی ذات والوں کی ذلیل ترین خدمت کرنا یعنی اُن کی غلاظت اور گندگی کو صاف کرنا ہیں ان کے کردار کی خصوصیات، محکومی، بزدلی اور قناعت ہیں۔ اونچی ذات والوں کے جبر و ظلم سہتے سہتے یہ اسقدر بے حس ہو چکے ہیں کہ اب ان کے نزدیک غیرت اور حمیت کے جذبات کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتے۔

اس گروہ کے بعد دیہات کی تمام زراعت پیشہ آبادی، ملوں اور کارخانو میں محنت مزدوری کرنے والے انسان، اور ہندوستان کی وہ اپاہج اور محتاج مخلوق جو فقیروں اور سادھوؤں کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ دوسرے گروہ کی زینت بنتی ہے اس گروہ کے انسان اپنی بدحالیوں کے اعتبار سے پہلے گروہ سے کچھ ہی بہتر ہیں۔ اقتصادی طور پر بھی یہ کچھ کم گرے ہوئے نہیں ہیں بلکہ یہ کیفیت ہے کہ ان میں سے کروڑوں محض ایک وقت روٹی کھا کر گذر کرتے ہیں۔ کسانوں اور مزدوروں کے علاوہ اوپری جماعتوں کی خدمت کرنیوالی تمام رذیلوں اور کمینوں کی آبادی بھی یہی طبقہ پیدا کرتا ہے۔ اس نکبت و افلاس سے مارے ہوئے طبقے کی امتیازی خصوصیت محنت ہے، یہ نہ صرف اپنا پیٹ پالنے کے لیئے محنت کرتے ہیں بلکہ درمیانے اور اعلیٰ طبقے کی

تمام ضروریات زندگی کو فراہم کرنا بھی انہیں کا فرض ہے یہی نہایت قلیل معاوضہ پر محنت کرکے خوشحال لوگوں کی تمام تمدنی ضروریات پورا کرتے ہیں اور یہی اپنا خون پسینہ ایک کرکے ملک کی تمام آبادی کی شکم پوری کا سامان بہم پہونچاتے ہیں۔

اس طبقے کی جہالت ہندوستان کے جسم کا وہ ناسور ہے جو رفتہ رفتہ اس کے تمام اعضاء کو بیکار کئے دے رہا ہے وہ مہلک بیماری ہے جو اُس کے جسم کو کھوکھلا کئے ڈالتی ہے۔ یہ طبقہ جہالت کی پیدا کردہ تمام خرابیوں اور کمزوریوں کے گراں بار سے دبا ہوا ہے۔ وہم، خوف، تعصب اور بزدلی کے جراثیم اس طبقے کے انسانوں میں بُری طرح پھیلے ہوئے ہیں اور قدامت پرستی ان کی رگوں میں خون کی مانند دوڑی ہوئی ہے قومی غیرت اور دلیری ان میں نام کو نہیں پائی جاتی۔ بزدلانہ قناعت ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ اگر ہندوستان پر انگریز راج کریں تو ان کی بلا سے اور اگر دُنیا کی کوئی اور قوم آجائے۔ تو انہیں کچھ پرواہ نہیں۔ ان کی جو معاشی اور معاشرتی حالت آج سے ایک ہزار سال قبل تھی وہی آج ہے اور اگر ان میں بیداری پیدا ہی نہیں ہوتی ہے تو ابدالآباد تک یوں ہی رہے گی۔ یہ آخر اس بات کو محسوس کیوں کریں کہ ملک کن سیاسی بندشوں میں جکڑا ہوا ہے۔ یہ اب بھی اوپری طبقوں کی دست بُرد کا شکار ہیں اور جب بھی رہیں گے۔

اس طبقے کے افراد دیہات کے کچے پھوس کے جھونپڑوں میں، شہروں کی نہایت گندی اور غلیظ گلیوں کی نہایت تنگ و تاریک کوٹھریوں میں گذربسر

کرنے کے عادی ہیں۔ چونکہ یہ غریب علم کی روشنی سے محروم ہیں اسلئے انسانیت
کے تمام محاسن ان سے نظریں چراتے ہیں نہ تو ان کے پاس اخلاق کا سرمایہ ہے
اور نہ یہ تہذیب سے آشنا ہیں۔ چور، اُچکّے، ڈاکو اور خونی، فریبی اور دغاباز،
جواری اور شرابخوار، بھیک منگے اور بیکار اس قسم کے تمام انسان اس گروہ
میں کثرت کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں اور یہی ہندوستان کی جیلوں کو رونق
بخشتے ہیں۔ چونکہ اوپری طبقے اس گروہ سے ہمیشہ خوفزدہ رہتے ہیں اسلئے
حکومت نے پولیس کا محکمہ قائم کردیا ہے جو ان انسانوں کو بد سے بدتر حالات
کا شکار بناتا رہتا ہے۔

یہ گروہ اپنی بہت سی خصوصیات کے اعتبار سے بھیڑوں اور بکریوں
کے گلوں سے ملتا جلتا ہے۔ جس طرح ا[illegible] گلّہ کے لئے ایک چرواہا بہت کافی
ہے۔ اسی طرح اس طبقے کے انسان بھی آنکھ میچ کر اوپری طبقے کے افراد کے
پیچھے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ جو کچھ اونچے طبقے کے لوگ ان کے لئے وضع کردیتے
ہیں خواہ وہ مذہبی اصول ہوں یا معاشرتی یہ انہیں اندھا دھند قبول
کرلیتے ہیں۔ زمیندار اور ساہوکار ان کے خداوند ہیں اور اُن کے نقشِ قدم
کی پرستش ان کا ایمان۔ لیکن اس کے باوجود یہ مذہب کے بھی پجاری
ہوتے ہیں اور اپنے آقاؤں کے مذہب کو یہ اپنی زندگی کا بڑا سہارا سمجھے ہوئے
ہیں۔ یہ ہر اُس مذہب کے نمائندے کی سیوا کرنے کیلئے ہمہ وقت آمادہ رہتے
ہیں جو انہیں اس زندگی کے دُکھوں سے چھٹکارا دلانے کا وعدہ کرے یا جو
انہیں اس بات کا یقین دلائے کہ اس زندگی کی مصیبتوں کا اجر آئندہ زندگی

میں مل جائے گا۔

یہ طبقہ چونکہ توہمات کا اسیر ہے اس لئے پنڈتوں اور ملاؤں سنت اور سادھوؤں، فقیروں اور درویشوں کی تگ و تاز کی جولانگاہ بنا ہوا ہے۔ ہر وہ شخص جو ایک مالا یا تسبیح ہاتھ میں لے کر اس گروہ کے درمیان آجائے وہ ان کی گاڑھے پسینے کی کمائی پر خوب چین سے بسر کر سکتا ہے۔ جسقدر ٹونے ٹوٹکے، تعویذ گنڈے قیاس میں آسکتے ہیں وہ سب اس طبقے کے افراد کا ایمان ہیں۔ اگر مسلمانوں کی مسجدوں میں رونق ہے تو اس طبقے کی بدولت اور اگر مندروں میں چہل پہل ہے تو انہیں کے دم سے لیکن۔ ؎

یہ مکتب یہ اسکول یہ پاٹھ شالے یہ تکیے یہ مندر یہ گرجے شوالے
یہ پنڈت یہ پنڈے یہ ملا یہ لالے یہ سب پیٹ ہیں اور ہم تر نوالے
غریبوں کا دنیا میں کوئی نہیں ہے

اس طبقے میں درندگی اور وحشت کے آثار بھی کبھی کبھی پیدا ہو جاتے ہیں اور اگر انہیں کوئی فرد مذہب کے نام پر ابھار دیتا ہے تو پھر یہ دیوانوں کی مانند ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ پھر قتل و غارت گری کی جو گرم بازاری ہوتی ہے وہ ہندوستان کے طول و عرض میں رونما ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہے۔

دنیا کے تمام مہذب ممالک میں بیداریٔ جمہور کا شور و غوغا مچا ہوا ہے۔ سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام ہیبت کے مارے لرز رہے ہیں لیکن اس

مُلک کے جمہور خدا کے فضل سے ابھی تک اُسی حالت میں پڑے ہوئے اوپری طبقوں کے مظالم سہ رہے ہیں۔ اس سکون و جمود کا سب سے بڑا سبب ان کی لاعلمی اور جہالت ہے جس نے ان میں خود آگاہی اور خودداری کے جذبات کو بالکل کچل دیا ہے۔ ؎

خواجگی میں کوئی مشکل نہیں رہتی باقی
پختہ ہو جاتے ہیں جب خوئے غلامی میں غلام

اول تو یہ بات قیاس میں مشکل سے سماتی ہے کہ ہندوستان کے کاندھوں پر سے غیر مُلکی حکومت کا جوا کبھی اُتر بھی سکتا ہے لیکن بفرضِ محال یہ مان بھی لیا جائے تو جب تک ہندوستان کے اس ادنیٰ طبقے کی جہالت دُور نہیں ہوگی۔ مُلک کی آزادی کچھ دیرپا ثابت نہیں ہو سکتی۔ مُلک کی حقیقی ترقیوں کا ضامن صرف یہی طبقہ ہو سکتا ہے جو فی الحال زمینداروں، جاگیرداروں ساہوکاروں اور حکومت کے عمّال کے ہاتھوں پستیوں کے بعید ترین گوشوں میں پڑا ہوا ہے۔

فریبِ خیال

جب راشد باتیں کرتے کرتے کوٹھی کے دروازہ کے نزدیک پہونچا تو وہ کچھ اس انداز میں مڑا گویا اب رخصت چاہتا تھا لیکن اُس کے ساتھ ہی ساتھ دوسرا نوجوان بھی جو اپنی باتوں میں منہمک تھا اور راشد کے اِس انداز کو نہ دیکھ سکا تھا، لوٹا اور وہ پھر دوبارہ ٹہلتے ہوئے اُسی طرف کو چلدئے جدھر سے وہ آئے تھے۔ ایک جگہ جاکر راشد ارادتاً رُک گیا اور ایک لاپرواہی کے ساتھ باتیں سُنتے ہوئے اُس نے دورویہ مہندی کے لگے ہوئے درختوں کی قطاریں سے کچھ پتّے توڑ لئے۔ دوسرا نوجوان برابر باتیں کئے جارہا تھا اور کبھی کبھی راشد کے چہرہ پر اپنی نظریں گاڑ دیتا تھا۔

راشد ایک نہایت باریک ململ کا کُرتہ پہنے ہوئے تھا جس کا دامن باربار ہوا کے جھونکے سے اُڑکر اُس کے سُرخ ریشمی ازاربند کو نمایاں کردیتا تھا۔ اُس کے کُرتے میں سے اُس کی باریک جالی کی بنیان جھلک رہی تھی اور پیروں میں وہ نہایت خوشنما چپّل پہنے ہوئے تھا اُس کے خوبصورت گھونگریالے بال جو غالباً ایک لاپروائی کے ساتھ اوپر کو لوٹے ہوئے تھے نہایت دل کش معلوم ہوتے تھے اور جب وہ زمین کی طرف دیکھتے دیکھتے یکایک اپنی نظریں اوپر کو اُٹھاکر کسی بات پر مسکراتا تو اُس کے گلابی رخسار

میں جو گڑھا پڑ جاتا تھا وہ اُس کے چہرہ کے حُسن میں چار چاند لگا دیتا تھا۔

دفعتاً راشد کسی خیال کے ماتحت مسکرایا۔ اُس کے دونوں رخساروں میں نہایت دیدہ زیب گڑھے پڑ گئے۔ اُس نے اپنی مسکراہٹ کو روکنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں وہ کامیاب نہ ہو سکا بلکہ وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ پھر اُسے کچھ خیال آیا اور اُس نے سنجیدہ بنتے ہوئے اپنی توجہ مہندی کے پتوں کی طرف مبذول کر دی اُسنے اُنہیں اپنی چٹکی میں مسلا اور پھر سونگھا۔ دوسرا نوجوان جو باتیں کرتے کرتے خاموش ہو گیا تھا اور راشد کی بے وقت ہنسی پر غور کرتے ہوئے اُس کے چہرے پر نظریں گاڑے ہوئے تھا متعجبانہ انداز میں دریافت کرنے لگا۔

"آپ کو اس وقت کس بات پر ہنسی آئی!۔ دیکھئے چھپائیے نہیں. سچ سچ بتائیے!"

"کچھ نہیں۔ یوں ہی" راشد نے مسکراتے ہوئے کہا اور مہندی کے مسلے ہوئے پتّوں کو پھینک دیا اور اپنے ہاتھ کی اُنگلیوں کو جن پر پتّے مسلنے سے دھبّے سے پڑ گئے تھے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے صاف کرنا شروع کر دیا۔ اب وہ پھر مسکرا رہا تھا اور جب دوسرا نوجوان مسکراہٹ کا سبب معلوم کرنے پر بہت مصر ہوا تو اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں اس بات پر ہنسا تھا کہ شمیم سینما جانے کے لئے میرا انتظار کر رہے ہوں گے!" یہ کہہ کر اُس نے ایک نازک قہقہہ لگایا اور کہنے لگا۔

"ماسٹر صاحب آپ جب باتیں کرنے کے موڈ (mood) میں آ جاتے ہیں بس پھر

آپ کو کچھ خبر نہیں رہتی!"

دوسرا نوجوان یہ سُنکر پہلے تو ہنسا لیکن پھر ایک خفت آمیز سنجیدگی کے ساتھ کہنے لگا "آپ نے مجھے پہلے سے کیوں نہ بتایا۔ بھئی واللہ آپ بھی خوب ہیں۔" یہ کہکر وہ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر کہنے لگا

"اچھا اب اجازت دیجئے اور شمیم صاحب کو جس قدر زحمت انتظار میں اُٹھانی پڑی ہو اُس کی میری طرف سے معافی مانگ لیجئے! اچھا خدا حافظ!" یہ کہکر دوسرے نوجوان نے بہت عجلت کے ساتھ مصافحہ کیا اور لمبے لمبے قدم رکھتا ہوا کوٹھی سے باہر نکل آیا۔

ماسٹر ایک ڈبلا پتلا زرد رو نوجوان تھا جس کی آنکھیں کافی اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور حلقوں کو خوب نمایاں کرتی تھیں۔ اُس کی آنکھوں کے ان عیوب کو چشمہ نے کسی حد تک چھپانے کی کوشش کی تھی۔ اُسکے رخساروں کی ہڈیاں بھی ضرورت سے زیادہ اُبھری ہوئی معلوم ہوتی تھیں اس لئے کہ اُس کے چہرہ پر سوائے کھال کے گوشت مطلق نظر نہ آتا تھا اور اُس کے پچکے ہوئے گالوں نے اُسکے چہرہ کو جو فی الحقیقت لمبا نہ تھا کافی لمبا بنا دیا تھا۔ اُس کی ڈاڑھی دو روز کی منڈی ہوئی معلوم ہوتی تھی جو کپڑے وہ پہنے ہوئے تھا اگرچہ میلے تھے لیکن اُن سے ایسا ظاہر ہوتا تھا گویا وہ اپنے لباس کے معاملہ میں بہت احتیاط برتتا ہے۔ کھدر کی ٹوپی ایک مخصوص کجی کیساتھ اُس کے سر پر منڈھی ہوئی تھی۔ شیروانی بھی کھدر کی تھی جس کے کالر سے

کچھ پھونسڑے سے اُبھر آئے تھے اور جن کی آستینوں کے آدھے ٹوٹے ہوئے بٹن دھوبیوں کی زیادتیوں کی فریاد کرتے تھے۔ انہیں آستینوں میں سے نکلے ہوئے قمیص کے کف تھے جو شیروانی کے سُکڑ جانے کی شکایت کر رہے تھے اور جن پر یہ نوجوان باربار ایسی نظریں ڈالتا تھا جیسے پردہ نشین خواتین کے شوہر انہیں کھڑکی میں سے جھانکتے دیکھکر ڈالا کرتے ہیں۔ جوتا اگرچہ پالش کیا ہوا تھا لیکن گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا اور اُس کی ایک سمت کو گھسی ہوئی ایڑیاں نوجوان کی بنی ہوئی چال پر اثر انداز ہو رہی تھیں۔

وہ چھڑی ہلاتا ہوا سوچتا چلا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ مضطربانہ انداز میں اپنے گرد و پیش نظریں دوڑاتا اور بار بار اس طرح پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا گویا کوئی اُس کا جاننے والا اُسے دیکھتا آ رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ اپنی کہنیوں سے اپنے پاجامے کے نیفے کو اس انداز میں گھماتا تھا جس سے اُس کے پاجامے کی سامنے کو آئی ہوئی سیون لوٹتی معلوم ہوتی تھی۔ اُس کا دماغ برابر سوچے جا رہا تھا وہ سوچنے کا بہت عادی تھا۔

"یہ میرے خاندان کے افراد میرے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے پر کس قدر انگشت نمائیاں کیا کرتے تھے ان جاہلوں کو کیا خبر کہ علم کی دولت وہ دولت ہے جسکے سامنے بڑے بڑے اپنا سر جھکا دیتے ہیں۔ آج کو اگر میں نے بی۔اے پاس نہ کیا ہوتا تو کیا راشد۔ نواب احمد اللہ خاں کا لڑکا میری اس طرح تعظیم کر سکتا تھا۔ ماسٹر صاحب ماسٹر صاحب کہتا اُس کا منہ تھکتا ہے۔ اور وہی نہیں بلکہ اُن کے تمام دوست احباب بھی میری ویسی ہی عزت کرتے ہیں۔ کاش کہ

میری بھی کچھ حیثیت ہوتی اور میں بھی ان لوگوں کو اپنے گھر بلانے کے قابل ہوتا۔ تعلقات اسی طرح تو بڑھتے ہیں۔ اب تو میں صرف ایک ماسٹر کی حیثیت میں ہوں ——— لیکن نہیں ——— میں اُن سے تنخواہ کب لیتا ہوں! آج مجھے راشد کے بھائی کو پڑھاتے ہوئے ڈھائی تین مہینے گذر گئے ہیں۔ میں نے اُن سے ایک دن بھی کسی پیسے کا سوال نہیں کیا نہ اُنھوں نے خود ہی اس کا کوئی ذکر چھیڑا ——— آخر میں نے خود ہی تو اُن کے بھائی کو پڑھانے کا ذمہ لیا تھا ——— جب انہوں نے مجھ سے ایک دن دریافت کیا تھا کہ ماسٹر صاحب آپ کی خدمت میں کیا پیش کیا جائے تو مجھے کسقدر گراں گذرا تھا۔ اگر میں دس پندرہ روپیہ کھ ہی دیتا تو اُن کا کیا بگڑ جاتا۔ دس دس پندرہ پندرہ کے تو اُن کے ہاں نہ جانے کتنے ملازم ہوں گے ——— ہاں مگر آج میری یہ پوزیشن نہ ہوتی ——— بس تھوڑا سا لحاظ ہوتا ——— ایک تنخواہ دار ماسٹر اور ملازم میں آخر کیا فرق ہے مانگنے مانگنے والے سب برابر۔ خواہ دو پیسے مانگنے والا ہو یا دو سو روپئے دونوں کو دینے والے کی نخوت کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ کیا میں بھی راشد کے ہاتھ کو تکتا ——— اجی لاحول بھیجئے! ——— توبہ کیجئے! ....

"بابو جی کیا کچھ بہرے ہو گئے ہو گھنٹہ بھر سے پکارتا چلا آرہا ہوں۔ ہٹتے ہی نہیں ایک طرف کو۔ ابھی ذرا میں چوٹ چپھینٹ لگ جائے تو قصور تانگے والے کا" یہ کہکر تانگے والے نے گھوڑے کے ایک چابک رسید کیا اور ماسٹر صاحب کی گھورتی ہوئی نظروں سے لاپرواہی برتتے ہوئے ایک تان اُڑائی۔

"اسی دن کا آسرا تھا مجھے مرگِ ناگہاں سے"

ماسٹر کا چہرہ غصّے سے تمتما اُٹھا۔ اُس نے پہلے تو گھبرا کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی کہ کسی نے تانگے والے کی یہ بات سُن تو نہیں لی پھر پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے چلنے لگا۔ "یہ کمبخت تانگے والے بھی کس قدر بدمعاش ہوتے ہیں! پاجی۔ گستاخ نہیں تو کہیں کا۔ ہمیں بہرہ بتاتا ہے! بات یہ ہے کہ یہ لوگ جوتے کے یار ہوتے ہیں۔ شرافت کا اِن پر مطلق اثر نہیں ہوتا۔ کسی نے سچ کہا کہ "لات کا بھوت بات سے باز نہیں آتا۔" دفعتاً اُسے کچھ یاد آگیا۔ "راشد کیسا شریف النفس انسان ہے" اُس نے اپنے دل میں کہا۔ "اُس دن جو شمیم تانگے والے پر برس پڑے تھے تو راشد نے بعد میں شمیم کو کتنا خفیف کیا تھا۔ اُس نے کہا تھا "تانگے والے بھی آخر ہمیں جیسے انسان ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ہمیں عمدہ تعلیم و تربیت اور بہتر سوسائٹی مل جاتی ہے اور انہیں انہیں سے کوئی بات بھی نصیب نہیں ہوتی۔" ماسٹر نے اپنے دل میں کہا "کاش کہ تمام اُمرا غریبوں کے متعلق اسی طرح سوچنے لگیں۔ لیکن اِن کمبختوں کو اپنے عیش و عشرت سے فرصت کب ملتی ہے کہ وہ دوسروں کے بارے میں بھی کچھ سوچیں۔ اور اگر سوچتے بھی ہیں تو ان کی آنکھوں پر جو تعصّب کی ٹھیکریاں رکھی ہوئی ہیں وہ کیسے دُور ہوں۔ یہ تو غریبوں اور نادار انسانوں کو جانوروں سے بھی گرا ہوا تصوّر کرتے ہیں۔ ہاں الیکشنوں کے موقعوں پر سرتاپا عجز و انکسار ضرور بن جائیں گے۔ . . . مکّار . . . . . . فریبی کہیں کے . . . . !"

ماسٹر اسی طرح سوچتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ شام کی تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ سڑکوں پر روشنی ہو گئی تھی۔ کوئی میل بھر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک گلی میں مُڑا۔ کوئی ایک فرلانگ چل کر وہ ایک اور پتلی سی گلی میں مڑ گیا۔ گلی میں بچے شور و غل مچا رہے تھے۔ کتے بھونک رہے تھے اور کسی نے گراموفون پر ایک بہت مکروہ آواز کا ریکارڈ چڑھا رکھا تھا۔ ماسٹر گلی کی متعفن فضا کو محسوس کرتا ہوا راشد کی کوٹھی کا اپنے محلے کے شور و شغف سے مقابلہ کرتا چلا جا رہا تھا۔ اُسے کھیلتے ہوئے بچے اور بھونکتے ہوئے کتے نہایت گھناؤنے معلوم ہو رہے تھے۔ ریکارڈ کی آواز تیر و نشتر کی طرح اُسکے سامعہ پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ اُس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ اُن سب کو گولی سے اُڑا دیتا۔ انہیں بچوں میں اُس نے اپنے چھوٹے بھائی عاقل کو بھی کھیلتے ہوئے دیکھا اُس کی قمیص پھٹی ہوئی تھی۔ پاجامے پر روشنائی اور کیچڑ کے دسیوں دھبے پڑے ہوئے تھے۔ اُس کے ہاتھ پیر اور مُنہ سب گرد و غبار میں اٹے ہوئے تھے۔ اُسے اِس حالت میں دیکھتے ہی وہ آگ ہو گیا اور اُس کی طرف لپکا۔ عاقل سہم کر ایک طرف کو اپنے دونوں رخساروں پر ہاتھ رکھکر کھڑا ہو گیا۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ماسٹر نے عاقل کے تین چار بید رسید کیں اور پھر جھنجلا کر اتنی زور سے اُس کا کان امیٹھا کہ اُس کی چیخ نکل گئی۔

عاقل تو روتا ہوا گھر کی طرف چلدیا اور ماسٹر کو راشد کا چھوٹا بھائی ماجد یاد آیا۔

"کسقدر تمیز دار اور سلیقہ مند بچہ ہے۔ صفائی تو اُس کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ دیکھتے ہی طبیعت خوش ہو جائے۔ ایک یہ ہمارے چھوٹے بھائی ہیں

ماسٹر جیسے ہی اپنے گھر میں داخل ہوا اُس نے ایسا محسوس کیا گویا وہ جہنّم میں داخل ہو گیا ہے۔ عاقل نے دھاڑیں مار مار کر آسمان سر پر اُٹھا رکھا تھا اور اُس کی ماں اُسے چمکارتی جا رہی تھی۔ ماسٹر کو دیکھتے ہی وہ بولی "صبر کر بچے" اس کی جان کو صبر کرؤ یہ کہکر اُس نے ماسٹر پر نہایت غضب آلود نگاہیں ڈالیں اور کہنے لگی" واہ بھیّا اچھے رہے۔ تمہیں اس چھوٹی سی جان پر یوں ظلم کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ آئے بڑے صاحب مارنے والے۔ بس تم اپنی اس تربیت کو اُٹھا کر چولہے میں ڈالو! میرا بچّہ یوں ہی اچھا ہے۔ تم اسے مارنے والے آخر ہوتے کون ہو۔ ابھی تو اس نے تمہاری کمائی کا ایک پیسہ بھی نہیں چکّھا ہے! جب ابھی سے تمہاری یہ حالت ہے تو آگے چل کر تو تم اسے زندہ دفن کر دوگے! .... باہر سے آئیں گے حکومت جتاتے ہوئے .... جیسے گھر میں سب اِن کے غلام بیٹھے ہیں۔ اسے مار اُسے پیٹ۔ پہلے کچھ ہو تو جاؤ۔ بعد ہی میں یہ نخرے بگھارنا!! ....

وہ دیر تک یوں ہی غُل مچاتی رہی۔ وہ یوں ہی غُل مچایا کرتی تھی۔ ماسٹر نے اپنے کپڑے اُتار کر کھونٹیوں پر ٹانگ دئے۔ شیروانی بھی۔ قمیص بھی اور بنیان بھی۔ اب وہ صرف پاجامہ پہنے ہوئے بیٹھا ہوا پنکھا جھل کر اپنا پسینہ خشک کر رہا تھا اور دل ہی دل میں برابر کلس رہا تھا" ہمارے ہاں کی یہ عورتیں بھی کس قدر جاہل ہوتی ہیں۔ بُرے بھلے کی مطلق تمیز نہیں کرتیں۔ بس صبح سے شام تک چیخنے اور غُل مچانے پر اُدھار کھائے بیٹھی رہتی ہیں۔ ہر وقت فساد پر آمادہ۔ .... یہ کیا جانیں تربیت کس چڑیا کا نام ہے۔

تعلیم کسے کہتے ہیں۔ بچّوں پر بُری صحبت کے کیا اثرات پڑتے ہیں" وہ بہت دیر تک یوں ہی سوچتا رہا۔ عاقل رو دھو کر خاموش ہو گیا تھا۔ اُس کی ماں بھی بک جھک کر گھر کے کام کاج میں مصروف ہو گئی تھی۔

ماسٹر اُٹھا اور اپنی میز پر رکھی ہوئی کتابوں میں سے دیوانِ غالبؔ اُٹھا کر اُس کے ورق لوٹنے شروع کر دیئے اور یہ شعر گنگنانے لگا۔

زندگی اپنی جب اِس شکل سے گذری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خُدا رکھتے تھے

ماسٹر جس کا نام فاضل تھا ایک خاصہ ذہین نوجوان تھا۔ بچپنے میں اُسکے والدین نے یوں ہی برائے گفتن اُسے ایک عربی مدرسے میں داخل کر دیا تھا۔ لیکن وہ اُن لڑکوں میں سے تھا جو بغیر کسی ہمّت افزائی کے محض اپنے شوق سے پڑھ جایا کرتے ہیں۔ وہ ہر سال نمایاں حیثیت کے ساتھ کامیاب ہوتا رہا اور وظیفہ حاصل کرتا رہا۔ جب اُس نے مدرسہ کا آخری امتحان پاس کیا تو اُس کے خاندان والوں نے کافی شور و غوغا بلند کیا کہ اُسے اب آگے تعلیم حاصل کرنے کا خیال ترک کر دینا چاہیئے۔ لیکن اُس نے کسی کی نہ سُنی اور انگریزی پڑھنی شروع کر دی۔ ذہن کا وہ شروع ہی سے تیز تھا اُس پہ طرّہ یہ کہ اُسے صرف زبان ہی میں امتحان دینا پڑتا تھا۔ اُس نے ایک ایک کرکے۔ میٹرک۔ ایف۔ اے اور بی۔ اے کے امتحانات پاس کرلئے اور اپنے والدین کے خلاف منشا، وہ بجائے ایک مولوی کی زندگی گذارنے

کے بڑے بڑے رنگین خواب دیکھنے لگا۔ اُس کے تصوّر میں وہ باتیں آنے لگیں جو بڑے انسانوں کے دماغوں میں آیا کرتی ہیں اور وہ اکثر سوچتا کہ ایک نہ ایک دن وہ بھی بڑا آدمی بن کر رہے گا۔

فاضل کو شعر و سخن سے خاص دلچسپی تھی اور اُس کی طبیعت میں اپنے ذوق کی مناسبت سے نفاست اور لطافت بھی کافی سے زیادہ عود کر آئی تھی لیکن اُس کی خانگی زندگی میں چونکہ کوئی لطافت نہ پائی جاتی تھی اِس لئے وہ ہمیشہ ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا رہتا تھا۔

اُس کا گھر غربت اور افلاس کی ایک زندہ تصویر تھا۔ اُس کا باپ ایک نہایت سیدھا سادھا معمولی لکھا پڑھا انسان تھا جو نئے تخیّلات اور تصوّرات سے بالکل ناآشنا تھا وہ اُن لوگوں میں سے تھا جن کو اس عالم میں محض خانہ پُری کے لئے بھیجد یا جاتا ہے۔ غالباً اُس کی زندگی کی سب سے نمایاں باتیں یہ تھیں کہ اُس نے اپنی عمر کے چالیس سال نہایت دیانت کے ساتھ ایک کارندے کی حیثیت میں بسر کئے تھے اور یہ کہ اُس نے تنگدستی کے عالم میں بھی کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا اور وہ اِن باتوں پر نازاں بھی تھا۔ وہ جب کبھی اپنی گذشتہ زندگی کے بارے میں ذکر کرتا تو یہی دو باتیں پھیلا پھیلا کر گھنٹوں سنایا کرتا تھا۔ ماسٹر کی ماں ایک چڑچڑے مزاج کی عورت تھی جس کی زندگی کا قریب قریب نصف حصّہ تو چولھے اور روٹی کی فکر میں بسر ہوا تھا اور باقی نصف سونے اور لڑنے میں گذرا تھا۔ ماسٹر اکثر سوچا کرتا کہ اُس کی ماں اُس سے ماؤں جیسی محبّت کیوں نہیں کرتی۔

لیکن اُس غریب کو اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ وہ اپنی ماںتا کے جذبات کو مجتمع کرکے اپنے شاعر بچّے کی آرزوؤں کو پورا کیا کرتی۔ وہ کبھی کبھی غصّہ کے عالم میں فاضل کو نصیحتیں بھی کیا کرتی تھی لیکن اُن کا لبِ لباب اکثر یہ ہوا کرتا تھا "اب تم کافی پڑھ لکھ گئے ہو کچھ کمانے کی فکر کرو" لیکن فاضل کچھ اور ہی سوچ رہا تھا اُس کے دماغ میں جو شاندار اسکیمیں آتی تھیں انہیں چھوڑ کر وہ بیس۲۰ تیس۳۰ روپیہ کی کلرکی پر کیسے رضامند ہو جاتا۔ چنانچہ اُس کی ماں کو اُسے بار بار "نکھٹو" کہنے کا موقعہ مل ہی جاتا تھا۔ اپنے چھوٹے بھائی کے متعلق وہ خود بھی حیران تھا کہ آخر کیا کرے۔ بی۔ اے کرنے کے باوجود وہ اُسمیں پڑھنے کا شوق پیدا نہ کر سکا تھا اور جس طرح وہ اُسے پڑھا سکتا تھا اُس کے والدین اُسکے اس رویّہ کے خلاف ہمیشہ صدائے احتجاج بلند کرنے لگتے تھے اور بالآخر وہ یہ کہکر خاموش ہو جایا کرتا تھا "میری بلا سے جہنّم میں جائے"

ماسٹر کی گھر کی زندگی میں اور خیالی زندگی میں اتنا زبردست فرق تھا کہ اُن میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش میں اُسکے اپنے ذہن کا توازن دن بدن بگڑتا جاتا تھا۔ جھونپڑے میں رہتے ہوئے وہ جن محلوں کے خواب دیکھا کرتا تھا وہ کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوتے تھے۔ اِس ذہنی کشمکش اور بیچارگی نے اُسے کچھ ایسے تصوّرات سے دوچار کر دیا تھا جن کی بدولت وہ اپنے دوستوں میں کچھ بدنام سا ہو گیا تھا۔ اس میں رفتہ رفتہ دہریت آتی جا رہی تھی اور اپنے بزرگوں کی تنبیہ کے باوجود وہ اپنی فرصت کا

بہت سا وقت محلہ کے اُن بزرگوں کے پاس گذارا کرتا تھا جن پر ان کی آزاد خیالی کے باعث کافی نام دھرے جاتے تھے۔

فاضل کے تعلقات راشد سے اس طرح قائم ہوئے کہ وہ اُن کے ایک عزیز کے یہاں پڑھانے جایا کرتا تھا وہاں کبھی کبھی راشد بھی جا بیٹھتے اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگتیں۔ اِدھر فاضل ایک، نہایت خوش گفتار انسان تھا اُدھر راشد بھی بہت نستعلیق انداز میں گفتگو کرتا تھا سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ دونوں کا مذاقِ شعری بھی یکساں تھا۔ ہوتے ہوتے تعلقات اسقدر بڑھے کہ فاضل راشد کی کوٹھی پر آنے جانے لگا اور جب اُس کی پہلی ٹیوشن چھوٹ گئی تو اس نے راشد کے چھوٹے بھائی ماجد کو خود ہی پڑھانے کا ذمّہ لے لیا اور اس بہانے سے وہ گھنٹوں راشد کی کوٹھی میں رہا کرتا۔ شاید اِس لئے کہ وہ کوٹھی کے پُرسکون و پُرفضا ماحول کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اور اپنا زیادہ سے زیادہ وقت وہیں گذارنا پسند کرتا تھا یا شاید اس لئے کہ اُسے ماجد سے کچھ اُنسیت ہو ہی گئی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اُسے ذہین بچّوں سے بہت جلد محبت ہو جاتی ہے۔

ماجد کو پڑھانے کا یہ سلسلہ فاضل کے لئے مہینوں نہایت دلچسپ بنا رہا۔ جب وہ ماجد کو پڑھا کر فارغ ہوتا تو اُن کی راشد سے گھنٹوں شعر و سخن پر گفتگو رہتی تھی۔ کبھی کبھی چائے کا وقت دورانِ گفتگو میں آجاتا تو راشد فاضل سے کچھ اس طرح شریک ہونے کو کہا کرتا کہ اُس کا انکار ایک

سہل انکار بن کر رہ جاتا تھا۔ دو ایک مرتبہ راشد نے فاضل کو اپنے ساتھ کھانے کو بھی کہا اور راشد کے دستر خوان کی نہایت لذیذ اور مرغن غذائیں کھانے کے بعد اگر فاضل نے اپنے دوستوں کے روبرو یہ کہدیا کہ آج راشد نے بڑے اہتمام سے ہماری دعوت کی تھی تو کچھ عجیب بات نہیں کہی تھی وہ اِسلئے کہ فاضل نے کبھی دعوتوں میں بھی ایسے کھانے نہیں دیکھے تھے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ فاضل کھانا کھانے کے بعد اپنی اُس کوٹھری کے آگے جسے اُس نے اپنی نشست گاہ بنا رکھا تھا۔ گلی میں کھڑی چارپائی پہ پڑا ہوا یہ شعر گنگنا رہا تھا۔ ؎

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہُنر میں یکتا تھے

بے سبب ہوا غالب دُشمن آسماں اپنا

وہ بار بار ٹھنڈی سانسیں بھرتا۔ اِدھر اُدھر کروٹیں بدلتا اور اپنی بدحالی پر غور کرنے لگتا جب اُس کا دماغ سوچتے سوچتے تھک جاتا تو وہ ایک گہرا سانس لیتا اور پھر اُسی شعر کو گنگنانے لگتا۔ وہ گلی کی طرف پیٹھ کئے چارپائی کے ایک طرف کو پڑا ہوا نیچے ہاتھ لٹکائے ایک تنکے سے زمین کو کرید رہا تھا اور گنگنا رہا تھا کہ دفعتہً اُس کے کان ایک سائیکل کی آواز پر متوجہ ہو گئے۔ اُلٹے پیڈل گھمانے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے وہ فاضل کے کانوں میں آرہی تھی اور اُسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ کوئی اُسکی بیٹھک کے سامنے ہی رُکنے والا ہے۔ اُسے فوراً اپنے پھٹے ہوئے پاجامہ کا

(جو وہ بطور لباس شب خوابی کے استعمال کیا کرتا تھا) خیال آیا۔ پھر اُس نے سوچا کہ اُس نے بنیان تک نہیں پہن رکھی تھی۔ اُسوقت اگر اُس کے اختیار میں ہوتا تو وہ فوراً پلنگ سے غائب ہوجاتا لیکن یہ باتیں قصّے کہانیوں میں تو ممکن تھیں حقیقی زندگی میں ایسا کب ہوتا ہے۔

سائیکل کی آواز ختم ہوگئی اور اُسے یقین ہوگیا کہ کوئی اُس کی بیٹھک کے سامنے رُکا ہوا ہے۔ اُس نے سوچنا شروع کیا کہ شاید فیّاض آیا ہے۔ پھر خیال آیا کہ ممکن ہے ممتاز ہو۔ لیکن وہ خود کو اس حالت میں نہ تو فیاض کے سامنے لانا چاہتا تھا اور نہ ممتاز کے سامنے۔ یک لخت اُس کے دماغ میں یہ آیا کہ کہیں راشد تو نہیں آگئے۔ پھر اُس نے سوچا کہ بھلا راشد کیسے آسکتے ہیں اُنھیں میرے مکان کا کیا علم۔ لیکن پھر بھی سائیکل کے اُلٹے پیڈل گھمانے کی آواز اُسے کچھ آشناسی معلوم ہوتی تھی۔ اُس نے ایکدم سے گھبراکر کروٹ بدلی تو دیکھا کہ راشد ایک ہاتھ سے دیوار پر سہارا لئے سائیکل پر سوار کھڑے ہیں اور کچھ سوچ رہے ہیں۔

"راشد صاحب"! فاضل نے گھبراکر مشکوک انداز میں پکارا۔

"آخاہ! ماسٹر صاحب! ارے یہ آپ تھے!! راشد نے مسکراکر متعجبانہ انداز میں کہا۔ "میں سوچ رہا تھا کہ آخر کیسے آواز دوں۔ بہت مشکل سے پتہ چلا آپ کے مکان کا۔" وہ پھر مسکرایا اور کہنے لگا "آپ کے آرام میں خلل تو نہیں پڑا۔"

"آرام! آرام ہماری قسمت کہاں! معاف فرمائیے میں اسوقت

بالکل (At home) ایٹ ہوم ہوں۔ غریب آدمی گھر پر اسی طرح رہا کرتے ہیں۔ کوٹھیوں کی زندگی اور ان تنگ و تاریک گندی گلیوں کی زندگی میں جتنا فرق بھی ہو وہ تھوڑا ہے۔" یہ کہکر فاضل نے کچھ ایسا محسوس کیا گویا اُس نے ایک بہت بڑی حقیقت واضح کر دی ہے اور اب اُسے اپنی برہنگی پر شرمندہ ہونے کی قطعاً ضرورت نہ رہی۔

"آئیے آپ تشریف رکھئے! آپ نے اسوقت کیسے زحمت گوارا فرمائی! میرے لائق کوئی کارِ خدمت! آپ سائیکل رکھدیجئے۔ میں ابھی آتا ہوں"۔ یہ کہکر جواب کا انتظار کئے بغیر فاضل گھر میں دوڑا ہوا گیا۔ جلدی سے قمیص گلے میں ڈالی۔ پاجامہ بدلا اور پھر اپنی والدہ کو جگایا۔

"کیوں خیر تو ہے! کیا مصیبت آئی! رات کو تو چین سے سو لینے دیا کرو۔ دن بھر تو......" اُس کی ماں نے غضبناک انداز میں کہنا شروع کیا اور وہ نہ جانے اور بھی کتنا کہتی اگر فاضل رازدارانہ انداز میں خوشامد کے لہجہ میں یہ نہ ظاہر کر دیتا کہ آج کا دن غل مچانے کا نہیں ہے۔

"کیا راشد آئے ہیں!...... لیکن میرے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں!..... اُدھار!...... وہ عاقل کو ہرگز نہیں دے سکتا تم خود چلے جاؤ.....!"

یہ کہکر اُس کی ماں گھبرا کر اُٹھی گویا وہ وقت ہی گھبراہٹ کا تھا۔ گھبراہٹ تو اُسوقت بھی ہوتی تھی جب مالک مکان یا لالہ کشن سروپ کا آدمی تقاضے پر آتا تھا لیکن اُس اضطراب میں بھی کسقدر اطمینان ہوتا تھا۔ اسوقت

گھر کے سب آدمی ایک ایک کر کے اس طرح اُٹھ رہے تھے گویا کوئی غیر معمولی واقعہ ہو گیا ہے۔ ہر شخص اُٹھتے ہی اشاروں ہی اشاروں میں سب کچھ سمجھ کر اپنے اپنے کپڑوں کو ٹھیک کرنے لگتا اور فاضل کی اماں جان نے تو اپنا دوپٹہ کچھ اس احتیاط سے اوڑھا جیسے راشد ابھی گھر میں آکر انہیں سلام کرنے والا تھا۔ شہر کے رئیس اعظم۔ نواب احمد اللہ خاں کا لڑکا راشد۔

فاضل نے جلدی سے دھوبی کے ہاں سے آئی ہوئی چادر نکالی اور بہت پھرتی کے ساتھ تکیئے کا میلا غلاف اُتار کر پھٹا ہوا لیکن دُھلا ہوا غلاف چڑھایا اور پھر بچھونا لپیٹ کر اس انداز میں باہر نکلا گویا وہ گھر میں بچھے ہوئے کسی بستر کو اُٹھا لایا ہے۔

"ماسٹر صاحب آپ اتنی تکلیف کیوں فرما رہے ہیں" راشد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

لیکن فاضل کے نزدیک وہ تکلیف عین راحت تھی۔ جب راشد بیٹھ گئے تو فاضل نے دریافت کیا "کہئے خیر تو ہے! آج آپ نے مجھے کس لئے نوازا؟ دیکھئے مرزا اسی موقعہ کے لئے کہہ گئے ہیں۔ ؎

وہ گھر میں آئیں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

راشد مسکرایا اور تکیئے کو دُہرا کر کے اپنے زانو پر رکھتے ہوئے بولا۔
"ماسٹر صاحب آپ تو کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں! بات یہ ہے کہ آج میری طبیعت سرِ شام سے ہی کچھ گھبرا رہی ہے۔ شمیم آپ کو معلوم ہے دہلی گئے ہوئے ہیں۔

اکرام کے یہاں گیا تھا وہ بھی نہ معلوم کہاں غائب ہیں۔ میں نے سوچا کہ سنیما چلوں۔ راج نرتکی کے متعلق سنتے ہیں بہت اچھی پکچر ہے۔ انگریزی میں بھی فلمائی گئی ہے! ہندوستان سے باہر جائیگی نا! کہتے ہیں سادھنا بوس کے (Dances) ڈانسز بہت خوب ہیں اور پرتھوی راج پھر اُسی "دیاپتی" والی شان میں نظر آرہے ہیں۔ لیکن تنہا کیسے جاتا۔ خیال آیا کہ آپ کو لیتا چلوں ...... بس اب اُٹھئے وقت بہت تھوڑا رہ گیا ہے۔ .....

نا نا اِن "تکلفات کو رہنے دیجئے!!"

"یہ نہیں ہو سکتا راشد صاحب! آپ اتنی دُور چل کر آئے ہیں۔ میں شربت پلائے بغیر نہ جانے دوں گا۔ ابھی دو منٹ میں تیار ہوا جاتا ہے! یہ سب مجھے ہی کرنا پڑے گا۔ گھر میں عاقل وغیرہ سب سو رہے ہیں۔ ہمارے ہاں سب نو ہی بجے تھک کر پڑ جاتے ہیں۔ غریب آدمی کو نیند بہت گہری آتی ہے۔" یہ کہکر وہ یہ سوچتا ہوا اُٹھا کہ اُس نے کسقدر غلط بات کہی تھی۔ اُسے ایسی نہ جانے کتنی راتیں یاد آگئیں جب اُس کے گھر والوں کی آنکھ رات رات بھر نہ جھپکی تھی ایک تو اُسی رات کو جسدن اُن کے گھر کا سامان لالہ کشن سروپ نے قرق کرایا تھا۔

اِدھر تو فاضل گھر میں داخل ہوا۔ اُدھر اُس کی والدہ نے پان بنا کر عاقل کے ہاتھ دیکر دروازے سے بھجوا دیئے۔ فاضل نے گھبرا کر پوچھا "اُس نے قمیص بھی گلے میں ڈال لی تھی یا نہیں؟" یہ سُن کر کہ نہیں اور بچہ ہی تو ہے فاضل کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُس نے دانت پیس کر کہا

"خدا کرے تم سب لوگوں کا ستیاناس ہو جائے" یہ کہکر وہ سنبھلا۔ اُسے خیال آیا کہ کہیں اُس کی ماں چیخنے نہ لگے۔ ابھی تمام عزّت آبرو پر پانی پھر جائے اور واقعی اُس کی ماں نے نہایت غضبناک نظروں سے اُسکی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہوش کی دوا کر لڑکے ہوش کی!.... آیا بڑا غیرت مند بن کر۔ اگر وہ نوّاب ہے تو اپنے گھر کا ہوگا ہمارا کیا اُس نے کچھ روزینہ مقرر کر دیا ہے۔ آیا بڑا کوسنے والا......" اور اُس کی ماں کا لیکچر شروع ہو گیا لیکن فاضل نے اسی کو غنیمت جانا کہ وہ یہ سب کچھ دھیمی آواز میں کہہ رہی تھی۔ وہ چُپ چاپ گھر سے نکل آیا اور بیٹھک میں ٹھہر کر اپنے چہرہ کی افسردگی کو مسکراہٹ میں تبدیل کرنے لگا۔ اس دوران میں باہر سے جو باتیں اُس کے کانوں میں آئیں وہ یہ تھیں۔

"میرا نام عاقل ہے...... بھائی جان ہمیں بہت مارتے ہیں.... آپ نے بھائی جان کی ایک دن دعوت بھی تو کی تھی۔ مجھے سب معلوم ہے بھائی جان ایک دن فیاض صاحب سے اس کا ذکر کر رہے تھے اور میں بیٹھک میں......"

وہ بات بھی پوری نہ کرنے پایا تھا کہ فاضل ایکدم سے باہر آ گیا۔ عاقل سہم کر خاموش ہو گیا۔

"کیوں قمیص کیوں نہیں پہنی!...... صاحب اس لڑکے نے مجھے اِسقدر تنگ کیا ہے کہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا...... بس ہر وقت باتیں بناتا رہتا ہے...... چل گھر میں!!"

فاضل راشد کے لئے شربت کا بندوبست کرتا تو لیکن اُس نے
دل میں سوچا کہ جتنی دیر میں تم شربت کا سامان لاؤ گے۔ عاقل تمام گھر
کی ہسٹری سُناڈالے گا۔ اسلئے وہ بولا۔
"چلیئے راشد صاحب۔ میں تیار ہو گیا۔ بس اک ذرا شیروانی اور
پہن آؤں! آپ ایسے بے وقت آئے کہ میں آپ کی خاطر بھی تو نہ کر سکا!
یہ دوسرا پان بھی کھا لیجئے نا۔ آخر اس میں مضائقہ کیا ہے !!"

فاضل راشد کے یہاں برابر جاتا رہا۔ اُس کے اپنے نزدیک راشد
کے اور اُس کے تعلقات برابر بڑھتے رہے۔ اگرچہ راشد اُس ایک دفعہ
کے علاوہ پھر کبھی فاضل کے یہاں نہیں پہنچا اور ایسا بھی کوئی اتفاق پیش
نہیں آیا کہ اُس کو اپنے دوستوں سے یہ کہنے کا موقع مل جاتا' راشد نے
پھر اُس کی دعوت بڑے اہتمام سے کی۔ لیکن پھر بھی وہ یہی سمجھتا رہا کہ
راشد اُس سے زیادہ قریب ہوتے جارہے ہیں۔ وہ اکثر گھنٹوں راشد
کے سامنے اپنی پریشان حالیوں کی داستان سُنایا کرتا۔ بعض اوقات تو وہ
اسقدر بڑھ جاتا کہ راشد ہنستے ہوئے نعوذ باللہ اور استغفر اللہ کہکر اُٹھ کھڑا
ہوتا اور کہنے لگتا " ماسٹر صاحب آپ تو کفر کے کلمے زبان پر لے آتے ہیں۔ خود تو
آپ گنہگار بنتے ہی ہیں۔ اپنے ساتھ مجھے بھی گھسیٹتے ہیں۔ بس اب یہ باتیں
چھوڑیئے کچھ اور سنائیے" اور پھر غالب' آتش یا اقبال پر گفتگو ہونے لگتی
اور راشد بتاتا کہ جو خیالات غالب نے فلسفیانہ انداز کے پیش کئے ہیں وہ

کس قدر "ہیگل" سے ملتے جلتے ہیں۔ یا پھر فاضل مولانا روم کی بے پناہ شاعری پر کچھ کہتا اور راشد یہ بتاتا کہ میتھو آرنلڈ نے کس قسم کی شاعری کو سراہا ہے اور فاضل میتھو آرنلڈ کی شعر و ادب پر تنقید بھی سنتا رہتا اور اپنے دل میں کہتا جاتا "کاشکہ مجھے بھی ایسا ہی علمی ماحول ملتا جیسا کہ راشد کو نصیب ہوا ہے۔ کاشکہ میرے والدین بھی کچھ پڑھے لکھے ہوتے۔ وہ انگلینڈ ریٹرن نہ ہوتے مگر ان میں کچھ تو روشنی طبع موجود ہوتی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے بھی ایسی ہی شاندار کوٹھی اور ایسا ہی ساز و سامان ملتا ہاں اگر احمد پورہ کا سا ذلیل ماحول تو نہ ہوتا۔" یہ سوچتے سوچتے وہ پھر اسی غیبی طاقت کو بُرا بھلا کہنے لگتا جس نے اس کی زندگی کو اسقدر ناقابل برداشت بنا رکھا تھا۔

راشد کے یہاں ایک بات فاضل کے لئے بڑی آزمائشی ہوتی تھی، اُسے سخت اُلجھن تھی وہ جس قدر کوٹھی میں زیادہ آتا جاتا تھا اُسی قدر وہ یہ اُمید کرتا کہ اب تو نوکر چاکر وغیرہ سب کو اُس سے مانوس ہو جانا چاہیئے انھیں سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ راشد کے ہاں ماسٹر بھی ہے اور اُن کا دوست بھی اور اس لحاظ سے بہر صورت قابل احترام ہے لیکن اسکی یہ آرزو کبھی پوری نہ ہوئی۔ جب کبھی راشد کوٹھی میں موجود نہ ہوا اُس نے ایسا محسوس کیا کہ ہر وہ شخص جس سے وہ راشد کے بارے میں کچھ دریافت کرتا اپنے لب و لہجہ سے اپنی باتوں کے انداز سے اُس پر یہ واضح کر دیتا کہ آپ ہیں کون راشد کے متعلق دریافت کرنے والے آپ کا راشد سے آخر تعلق کیا ہے

یہی ناکہ آپ انہیں پڑھاتے ہیں تو حد سر رہے۔ آپ سے پہلے بھی نہ جانے کتنے ماسٹر آئے اور چلے گئے۔ آپ میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں اور فاضل سوچتا کہ انہیں کیا معلوم کہ میں ان ماسٹروں میں نہیں ہوں جو محض دس، بیس روپیہ کی خاطر صرف گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھ کر چلے جایا کرتے تھے۔ میں تو چار پانچ مہینہ سے برابر آرہا ہوں۔ گھنٹوں محنت کرتا ہوں اور آج تک ایک پیسہ کا سوال نہیں کیا۔ اُسے کوٹھی کے شاگرد پیشہ افراد کا یہ طرز عمل بہت گراں گذرتا اور کبھی کبھی وہ سرسری انداز میں راشد سے اُس کی شکایت بھی کرتا لیکن راشد مسکرا دیتا اور بتاتا کہ نوکروں چاکروں کی کیا ذہنیت ہوتی ہے۔

آج جو فاضل نے گھر میں قدم رکھا تو ایک عجیب کہرام مچا ہوا تھا۔ اُس کے ابا جان تہمد باندھے ہوئے صحن میں غل مچاتے پھر رہے تھے اور اُس کے ماموں جان بیٹھے ہوئے اُن کی ہاں میں ہاں ملا کر اُس کی والدہ کو بھر رہے تھے جیسے ہی فاضل پر اُن لوگوں کی نظریں پڑیں تو ایک لمحہ کے لئے سب خاموش ہو گئے لیکن فاضل کی اماں جان کچھ اس انداز میں بھڑکیں گویا وہ ایک دبی ہوئی آگ تھیں جو کافی کریدے جانے کے بعد ایک ہوا کے تیز جھونکے کی منتظر تھی۔ فاضل کی آمد گویا ہوا کے ایک تیز جھونکے کی آمد تھی جس نے اس آگ کو بھڑکا دیا اور اسمیں شعلے بلند ہونے لگے۔

”کیوں بھیا اب تو تم جوان ہو گئے۔ ماشاءاللہ پڑھ لکھ گئے۔

بڑے لوگوں کی صحبت میں اُٹھتے بیٹھتے ہو کیا تمہیں کمانے کی کچھ فکر نہیں۔
آخر اس گھر کے پوت کس طرح پورے ہوں۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ صبح
وہ لالہ کا آدمی آیا تھا اور کیا کہہ گیا ہے۔ اس وقت ابھی ابھی ٹھیکیدار
ہو کر گیا ہے اور کہتا تھا کہ اگر کل تم نے تین مہینے کا کرایہ ادا نہیں کیا۔ تو
انگڑ کھنگڑ سب پھنکوا دوں گا۔ تمہارے ابا نے اُس کی جتنی خوشامدیں کیں
وہ اُسی قدر تیز ہوا۔ نوبت گالم گلوج تک آ پہونچی۔ ہم تو یہ سمجھے تھے کہ وہ
بک جھک کر چلا گیا۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ اسحٰق کو لیکر پھر آیا۔ اُس
شہدے اسحٰق نے پکار کر کہدیا کہ اگر کل کرایہ کا بندوبست نہیں ہوا تو سب
سامان اُٹھا کر نالے میں پھینک دوں گا۔ اب تم تو اسحٰق کو جانتے ہی ہو
وہ ایک بدمعاش آدمی ٹھیرا۔ اُسے تو کوئی بہانہ ہاتھ آیا چاہیئے پھر لوگوں کی عزت
آبرو اُتارتے اُسے کچھ دیر نہیں لگتی۔ کیا پڑوس کا وہ واقعہ یاد نہیں؟ آخر تم جو
ان لوگوں میں اس طرح اپنا وقت گنواتے ہو اس کا تمہیں کوئی صلہ بھی ملا؟
وہ نواب صاحب کے لڑکے تو تمہارے بہت دوست بنتے ہیں۔ اُن سے
آج تک نہ ہوا کہ تمہیں کہیں نوکر چاکر ہی کرا دیتے۔ کیا وہ اتنا کرنے سے بھی گئے!
میں تو پہلے ہی کہتی آئی ہوں کہ یہ بڑے آدمی بلّی کے گو ہوتے ہیں نہ لیپنے کے
نہ پوتنے کے۔ لیکن تم اسی ٹر میں مرے جاتے ہو کہ تمہارا بڑے آدمیوں سے
میل جول ہے۔ آخر تم چار پانچ مہینے سے راشد کے بھائی کو پڑھانے جاتے ہو
تمہیں کیا صلہ ملا یوں ہی لینا ایک نہ دینا دو۔ ٹرّخ ٹرّخ کرتے چلے گئے اور
چلے آئے۔ ہم نے تو ایک دن بھی نہ دیکھا کہ اُنہوں نے تمہارے ساتھ کوئی سلوک

کیا ہو۔ لینے کا ایک ہاتھ اور دینے کے ہزار ہاتھ ہوتے ہیں۔ کیا وہ چاہتے تو کسی نہ کسی بہانے تمہارے ساتھ کچھ سلوک نہیں کر سکتے تھے۔ آخر ماسٹر رکھتے تو اُسے دس پندرہ روپیہ ماہوار دیتے یا نہیں۔ تم تو انہیں اتنی مدّت سے پڑھا رہے ہو۔ اگر کسی جگہ ٹیوشن پڑھاتے تو گھر میں کچھ تو آتا۔ وہ امین صاحب کے ہاں جو صاحب رہتے ہیں وہ اُن کے بچّوں کے پڑھانے کا کچھ نہیں لیتے لیکن یہ بھی دیکھتے ہو کہ امین صاحب اُن کے ساتھ کتنا سلوک کرتے ہیں۔ رہنے کو جگہ دے رکھی ہے۔ کھانے کو دیتے ہیں۔ خاندان بھر اُن کی کسقدر عزّت کرتا ہے۔ ایک تم ہو کہ بس اسی بات میں فنا ہو گئے کہ نواب صاحب کے لڑکے ہمارے دوست ہیں۔ آخر یہ دوستی کسی دن کام آئے گی بھی یا نہیں۔ کیا وہ اتنا نہیں کر سکتے کہ تمہیں پندرہ روپیہ دیدیں۔ ذرا سوچو تو کہ اگر تم تنخواہ لیتے تو آج تک کا کیا حساب بیٹھتا۔"

فاضل اپنی ماں کی باتیں سُنتا رہا اور ایک ایک کر کے اپنے کپڑے اُتارتا رہا۔ اُسے آج اپنی ماں کی باتوں میں بہت کچھ حقیقت جھلکتی نظر آ رہی تھی وہ اُس کی کسی کسی بات کی تردید کرتا۔ لیکن دل ہی دل میں۔ اُس کی ماں برابر کچھ نہ کچھ کہتی رہی۔ اُس نے کھانا اُتار کر فاضل کے سامنے رکھا اور اُس کی پائنتی بیٹھکر اُسے سمجھانے لگی کہ اُس پر گھر کی کتنی ذمّہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ یہ کہ اگر وہ کچھ نہیں سوچے گا تو اُن کے دلدّر کبھی دُور نہیں ہو سکتے۔ اور راشد بھی ان باتوں پر غور کرتا جا رہا تھا اور پانی جیسے شوربے میں ڈبو کر نوالے حلق سے بہ جبر اُتارتا جاتا تھا۔ کھانا کھا کر وہ مکان کی چھت پر بچھے ہوئے

پلنگ پر جو عرصہ سے گلی میں نہیں بچھا تھا لیٹ گیا۔

سورج ڈوب چکا تھا۔ دُنیا پر رفتہ رفتہ اندھیرا چھا تا جا رہا تھا۔ چاند کی روشنی جو سورج کے سامنے بالکل ماند تھی آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی اور فضا کے گرد و غبار پر غالب آتی جاتی تھی۔ گلی میں بچے شور مچا رہے تھے۔ مسجد سے اذان کی آواز آ رہی تھی۔ کتے بھونک رہے تھے۔ کبھی کبھی گلی سے کوئی تانگہ گذرتا تھا اور گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز جس رفتار سے بڑھتی تھی اُسی انداز میں مدّھم ہوتی چلی جاتی تھی۔ سائیکلوں کی گھنٹیوں کی آواز متواتر آ رہی تھی۔ کوئی بچہ پرا پڑھتے جا رہا تھا۔ فاضل پلنگ پہ پڑا ہوا آسمان کو ٹکٹکی باندھے ہوئے تاک رہا تھا۔ وہ آج بیحد ملول و غمگین تھا اُسے ہر شے اُداس نظر آ رہی تھی۔ ہر صورت پژمردہ۔ نویں یا دسویں رات کے چاند میں سے خون کی سُرخی جھلکتی معلوم ہوتی تھی۔ ہوا کے جھونکے جو گرمی کی اُس کو چند لمحوں کے لئے دُور کر دیتے تھے۔ اپنے ساتھ لائی ہوئی تازہ حرارت فضا میں شامل کر دیتے تھے۔ فاضل کی پائینتی بیٹھا ہوا اُس کا چھوٹا بھائی عاقل اپنے ناخنوں کو دانتوں سے چبا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنی نظریں گھٹنوں پر رکھی ہوئی کتاب پر اسطرح ڈالتا تھا گویا وہ اُس کے حصّوں کو ازبر کر رہا تھا۔ وہ دُزدیدہ نظروں سے فاضل کو دیکھتا جاتا تھا اور فاضل سب باتوں سے بے نیاز آسمان کو تکے جا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھرتا اور عاقل سہم کر کوئی لفظ گنگنانے لگتا۔

سب گھر والے ایک ایک کر کے سو گئے۔ فضا میں ایک سنّاٹا سا چھا گیا۔ کبھی کبھی کسی کتّے کے بھونکنے کی یا کسی چوکیدار کی آواز آ جاتی تھی اور پھر خاموشی ہی خاموشی۔ فاضل پڑا ہوا برابر کچھ نہ کچھ سوچے جا رہا تھا۔ وہ ایک عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ کہتے ہیں کہ سولی پر بھی نیند آ جاتی ہے لیکن آج کی رات فاضل کو مطلق نیند نہ آئی۔ اگرچہ وہ کھرّے پلنگ ہی پر سونے کا عادی تھا لیکن آج اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اُس کے پلنگ پر گوکھرو بچھا دئے گئے تھے جب بھی وہ کروٹ بدلتا وہ کانٹے اُسکے پہلو میں چبھتے اور اُن کی چبھن اُس کے دل اور دماغ کو اذیّت پہونچا رہی تھی۔

آج فاضل خلافِ معمول بہت سویرے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے مُنہ ہاتھ دھو کر اپنے کپڑے بدلے اور چھڑی ہاتھ میں لے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ ساری رات سوچتے سوچتے اُس کا دماغ بالکل تھک گیا تھا لیکن وہ پھر بھی برابر سوچ رہا تھا ——— "تو آج مجھے راشد کے سامنے ہاتھ پھیلانا ہی پڑیگا ——— لیکن یہ ہاتھ پھیلانا ہوا کہاں! اُس دن جو راشد کے دوست اکرام اُن سے پچیس روپیہ لے گئے تھے تو کیا اُنہوں نے راشد کے آگے ہاتھ پھیلایا تھا یا راشد نے اُن کو اس بنا پر اپنی نظروں میں حقیر ٹھہرایا! نہیں۔ ہرگز نہیں، راشد کی شرافتِ نفس اس بات کو کیسے گوارا کر سکتی ہے کہ وہ دوستوں کی معذوریوں کی وجہ سے اُنہیں حقیر سمجھے ——— اور والدہ بھی تو کسی حد تک صحیح کہتی ہیں۔ آخر یہ دوست

بُرے وقت کام نہ آئیں گے تو کیا ہمیں جنّت میں بخشوائیں گے ـــــــ
دوست تو فی الحقیقت وہی ہے جو آڑے وقت کام آئے۔
لیکن میری طبیعت اس بات کو گوارا نہیں کرتی کہ راشد سے کچھ مانگوں
لیکن اگر نہ مانگوں تو پھر آخر کیا صورت اختیار کروں ـــــــ وہ ٹھیکیدار
اسحٰق کو لیکر آن موجود ہوگا؟ اسحٰق کا نام ذہن میں آتے ہی اُسکے سامنے
ایک نقشہ سا کھنچ گیا۔ اُسے اپنے گھر کا تمام سامان گلی میں پڑا ہوا نظر
آنے لگا۔ پلنگ بھی۔ پیڑھے بھی۔ ٹوٹی ہوئی چوکی بھی اور اپنی ٹین ٹانگ
کی میز بھی۔ اسٹول بھی اور جان سے زیادہ عزیز کتابیں بھی ـــــــ
اُس نے اپنے دماغ کی اس فلم سازی کو روکنا چاہا لیکن اُسے یہ سب
کچھ سنیما کے پردہ سے بھی زیادہ تیز طور پر نظر آرہا تھا۔ اُس کی کتابیں اِدھر
اُدھر منتشر پڑی تھیں اور دیوانِ غالب جس کو وہ بقول عبدالرحمٰن بجنوری
کے ہندوستان کی الہامی کتاب سمجھتا تھا نالی میں کھلی پڑی تھی کیچڑ
میں لت پت۔ اسحٰق بار بار گھر میں گھستا اور ایک نہ ایک چیز دروازے
سے نہایت بیدردی کے ساتھ گلی میں پھینک دیتا۔ عاقل دھاڑیں مار کر
رو رہا تھا۔ اُس کے ابّا جان خاموش ایک طرف کھڑے ہوئے اپنے گھر
کے سامان کی مٹّی پلید ہوتے دیکھ رہے تھے اور اُس کی ماں برقعہ اوڑھے
صحنچی میں بیٹھی رو رہی تھی۔
فاضل چلتے چلتے ایک ساتھ ٹھہر گیا۔ اُس نے اپنے چاروں طرف
نظریں دوڑائیں۔ وہ کباڑی بازار میں کھڑا ہوا تھا۔ اور ابھی بازار کی

دکانیں کھلی بھی نہ تھیں۔ اُس نے اپنے گھومتے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور سوچنے لگا کہ کہیں وہ پاگل نہ ہو جائے۔ وہ کچھ دیر تک یوں ہی سنسان سڑک پر کھڑا رہا۔ اُس کی طبیعت کسی قدر سکون پذیر ہوئی تو اُس نے ایک فیصلہ کُن لہجہ میں کہا۔ "نہیں۔ یہ سب کچھ ہرگز نہیں ہو سکتا" اور وہ پھر تیزی سے چلنے لگا۔ مسجد کے لوگ نماز پڑھ پڑھ کر نکل رہے تھے۔ ہر ایک کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے انہیں دیکھ کر فاضل کے دماغ میں نہ جانے کیا کیا خیالات چکّر لگانے لگے۔ اُس کے چہرہ پہ درشتی کے آثار پیدا ہو گئے۔ اُس نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ دل میں کہا۔ "راشد نماز روزہ کا کسقدر پابند ہے۔ جب کبھی میں اُس کے سامنے ان فرضی حقیقتوں کا انکشاف کرنے لگتا ہوں تو وہ کسقدر گھبرا جاتا ہے۔ راشد کی گھبراہٹ کا منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے اس طرح آیا کہ وہ بے اختیار ہنس پڑا" آخر راشد کے دماغ میں یہ سب باتیں کیوں نہیں آتیں ——— لیکن اُس کے دماغ میں کیوں آئیں۔ وہ جس اطمینان اور سکون کی فضا میں اپنی زندگی بسر کر رہا ہے اُس میں اِن خیالات کا گذر ہو کب سکتا ہے۔ لیکن پھر یہ ہمہ دانی کے دعوے کیوں؟ یہ مطالعہ آخر کس کام کا ——— آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان کی تیاری ——— طبّاعی اور ذہن کی جودت بڑھانے کے لئے تفریح طبع کی خاطر ——— سوسائٹی میں ایک باعلم انسان کہلائے جانے کے لئے ——— میں جو اُس غیبی طاقت پہ بگڑتا ہوں تو راشد کیوں مُنہ بناتے ہیں۔ اُس طاقت سے جو تعلق اُن کا ہو

وہی میرا بھی ہے۔" لیکن دفعتاً اُس کے دماغ میں ایک بات آئی اور اُسکی پیشانی اور چہرہ پر شکنیں پڑ گئیں۔ اُس نے ایک طنز کے ساتھ کہا "اُنہیں میری باتیں سُنکر برافروختہ ہونا ہی چاہئے۔ وہ اُس طاقت کے گُن گا رہی ہیں جس نے اُنہیں یہ اطمینان اور سکون بخشا ہے۔ رہنے کے لئے ایک عالیشان کوٹھی —— دل بہلانے کے لئے سرسبز و شاداب جنّت نما باغ۔ اطاعت اور فرماں برداری کے لئے نوکر چاکر۔ حضور سرکار کہتے ہوئے لوگوں کے مُنہ سوکھتے ہیں۔ ماحول کا ذرّہ ذرّہ اُن کی تابعداری کرتا ہے۔ اُن کے ناز اُٹھاتا ہے۔ اُن کے والد شہر کی سوسائٹی کے آفتاب —— بڑے بڑے رؤسا اُن کے آستانے پر سر جُھکانے کو ہمہ وقت آمادہ ——
وہ اگر ان تمام باتوں کی موجودگی میں اپنے پروردگار کا ہمہ وقت شُکر ادا کرتے رہتے ہیں اور نماز ہی پر اکتفا نہ کرکے گھنٹوں وظیفہ بھی پڑھتے ہیں تو کون سے تعجّب کی بات ہے۔ واقعی اگر اُنہیں عبادت سے سکون و اطمینان حاصل نہیں ہوگا تو کیا مجھے ہوگا۔" اور پھر یکایک اُس کی نظروں کے سامنے اپنے ماحول کا نقشہ کھنچ گیا۔ اُس نے ایک خندۂ استہزا بلند کیا اور کہا "وہ طاقت راشد کی دوست ہے پُشتہا پُشت سے دوست چلی آتی ہے اور اُن کی دل دہی کے سامان بہم پہونچاتی رہتی ہے اور میری...... میری"

آج فاضل اپنے دستور کے خلاف غیر وقت کوٹھی چلا آیا تھا ——

اُس نے رات کے وقت طے تو یہی کیا تھا کہ وہ راشد کو صبح سویرے جاتے ہی اپنی روداد سُنادے گا اور اُسے وہ تقریر بھی خوب یاد تھی جس کے ذریعہ وہ

اپنی ذہنی اور مالی مشکلات راشد کے سامنے رکھنا چاہتا تھا لیکن اُس نے سوچا کہ ابھی بہت سویرا ہے کیوں کسی کے آرام میں خلل ڈالے آخر وہ باغ میں چہل قدمی کرنے لگا ——— سبزہ کا مخملیں فرش ——— پھولوں سے لدی ہوئی کیاریاں ——— گلاب کے درختوں کے نظر فریب قطعات۔ چمبیلی۔ رائے بیل۔ موتیا اور مولسری کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو۔ صاف اور شفاف پانی سے لبریز نالیاں ——— یہ سب کچھ روزانہ اُس کے قلب و نظر کو آسودہ کیا کرتے تھے۔ وہ مالی کی تیکھی نظروں کے باوجود باغ میں ٹہل کر اپنی طبیعت کی پراگندگی کو دُور کرنے میں کامیاب ہو جایا کرتا تھا لیکن آج ——— آج ہر شے اُسکی آنکھوں میں کھٹک رہی تھی۔ وہ راشد کی زندگی پر رشک کر رہا تھا۔

دفعتاً وہ قدموں کی آواز سُنکر ٹھٹک گیا۔ ایک روش پر راشد پھولوں کو توڑتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ راشد کا چہرہ پھولوں سے بھی زیادہ شگفتہ و شاداب نظر آ رہا تھا۔ راشد کے چہرہ کا حُسن اور اُس کی آہستہ خرامی دیکھکر فاضل جیسے اپنے تمام رنج و محن کو بھول گیا۔

"راشد صاحب! گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند"

"ارے ماسٹر صاحب یہ آپ ہیں۔ میں بھی تو کہوں کہ آخر آج یہ کون حضرت چہل قدمی فرما رہے ہیں۔ کہئے آج یہ خلاف معمول اسوقت کیسے؟ ہاں ذرا وہ شعر پھر تو پڑھیئے۔ مجھے بیحد پسند ہے۔ ع۔ کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند"

خلافِ معمول کا لفظ سُنکر فاضل کچھ گھبرایا سا اُسے اپنی شعریت اور محویت دُور ہوتی معلوم ہوئی لیکن اُس نے فوراً خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"کچھ ایسا ہے۔ ؎

زغارتِ چمنت بر بہار منّت ہاست

کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند"

راشد نے اِس شعر سے حظ حاصل کرنا شروع کر دیا۔

"علی حزیں ہیں شاید؟" راشد نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

"کہہ نہیں سکتا۔ شاید وہی ہیں" فاضل نے کہا۔

"ماسٹر صاحب علی حزیں بھی اپنے زمانہ کا ایک زبردست دماغ ہو گذرا ہے بس علی حزیں کے بعد فارسی شاعری پر زوال آ گیا۔ آج کل کی شاعری دیکھئے تو متلی سی ہونے لگتی ہے۔ علّامہ اقبال نے جو کہا ہے۔ ع "اُن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے"۔ تو بس آج کل اسی وطن کی پرستش ہو رہی ہے ایران میں۔ اور مزدور اور سرمایہ دار کا رونا بھی خوب رویا جاتا ہے۔"

یہ کہکر راشد نے تو اُسی شعر کو تکرار کے ساتھ پڑھنا شروع کر دیا اور فاضل کی زبان پر بے اختیار اقبال کا یہ مصرعہ آ گیا۔ ع۔

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب

اور پھر اُس کا ذہن اپنی اُلجھنوں کی طرف منتقل ہونے لگا۔ اُس نے اپنے دل میں کہا: "مجھے اب سب کچھ کہہ ہی دینا چاہئے۔ دیر نہیں لگانی چاہئے۔ ورنہ ممکن ہے کوئی اتفاق پیش آ جائے"۔ وہ اتفاقات سے بہت ڈرتا تھا۔ اُسکی زندگی کو انہیں اتفاقات نے تباہ کیا تھا اور جب کبھی وہ کوئی ایسا کام کرتا

جیسے ہی اُسے اپنے نفع کی کوئی صورت نظر آتی تو اُسے انہیں الفاظات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ وہ دل میں گھبرایا کہ کہیں آج بھی کوئی ایسی ہی بات پیش نہ آجائے۔ اُس نے سوچا " مجھے اب سب کچھ کہہ دینا ہی چاہئے لیکن آخر مجھے کتنا روپیہ مانگنا چاہئے۔ پندرہ روپیہ تو اُسے ٹھیکیدار ہی کو دینے پڑیں گے۔ بیس۲۰ مانگے لیتا ہوں۔" اور اُس نے کچھ کہنا چاہا لیکن الفاظ اُسکے گلے میں ہم کر اٹک جاتے تھے۔ اُسکی زبان سے کچھ ادا نہیں ہونے پاتا تھا۔

"راشد صاحب آج میں ......" بالآخر اُس نے ہمت کرکے کہا۔

"کیوں؟ آج آپ پھر کسی مسئلہ پر غور فرما رہے ہوں گے۔ ماسٹر صاحب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر آپ کو اِس دُنیا اور اس کے تمام عقدوں کے حل کرنے کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟ ...... آج آپ کچھ پریشان سے بھی تو نظر آرہے ہیں ...... آپ کا چہرہ بہت مضمحل معلوم ہوتا ہے۔ واللہ آپ اِن اُلجھنوں میں نہ پڑا کیجئے!" راشد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں ...... نہیں! اُلجھنیں کیا یوں کہئے ...... کوئی ایسی خاص بات تو ہے نہیں ...... بات یہ ہے کہ ...." فاضل نے ایک ذہنی کرب کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس تمہید پر آجائے جو اُسنے اپنی شب بیداری میں کافی غور و فکر کے بعد تیار کی تھی لیکن آج اُس کی زبان کو نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔

"بس اب آپ ضرور کسی اپنی ذہنی اُلجھن کا حال سُنائیں گے۔ ماسٹر صاحب! آپ کی اِن باتوں سے مجھے کچھ وحشت سی ہونے لگتی ہے۔"

راشد نے پھولوں کو سونگھتے ہوئے مسکرا کر کہا اور موضوع بدلتے ہوئے بولا۔
"لیجئے آپ کو کل کی بات سنائیں۔ شام کو وہ اقبال پوڑم پھر آئے تھے۔ ٹھیک آپ کے جانے کے بعد۔ لگے بحث کرنے۔ میں نے کہا۔ اقبال صاحب جب آپ شعر موزوں پڑھ نہیں سکتے تو آپ شاعری پر تنقید کرنے کا کیا حق رکھتے ہیں۔ بہت برہم ہوئے کہنے لگے یہ آپ نے کیسے تصور کر لیا۔ وہ کونسا شعر ہے جسے میں موزوں نہیں پڑھ سکتا۔ میں نے غالب کی وہی افتاں خیزاں بحر والی غزل۔ ع۔ گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو۔ سامنے رکھ دی۔ انہوں نے کوشش شروع کر دی۔ بس پھر کیا تھا اتنے ٹھٹھے لگائے ہم لوگوں نے کہ بس توبہ ہی بھلی۔"

"کیوں۔ کیا کوئی اور بھی تھا؟" فاضل نے دریافت کیا۔

"ہاں شمیم بھی آگئے تھے اور انہوں نے اقبال صاحب کو چھیڑنے کیلئے وہی شیعہ سنی والا مسئلہ چھیڑ دیا تھا۔" یہ کہکر راشد دفعتاً کچھ خاموش سا ہو گیا۔

ادھر فاضل نے سوچا کہ بس اب مجھے اپنا مقصد بیان کر ہی دینا چاہئے۔

"راشد صاحب بات یہ ہے کہ آج میں بہت پریشان ہوں۔ یہ کمبخت پیسہ ایسی بُری بلا ہے۔۔۔۔۔۔"

فاضل نے اپنے اوسان بجا کرتے ہوئے سنجیدگی کیساتھ کہنا شروع کیا۔

"بس کچھ نہ پوچھئے۔ کوئی میرے دل سے پوچھے۔ آج میں خود اسی مسئلہ پر غور کر رہا ہوں۔" راشد نے فاضل کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

فاضل کا دل یہ سنکر دھک سے رہ گیا اُسے اِن الفاظ کے پردہ سے

محرومی جھانکتی ہوئی نظر آئی۔
"کیوں آپ کو اس پر غور کرنے کی ضرورت کیوں آ پڑی ؟ ہم نے تو سُنا ہے کہ حلوائی کا مٹھائیوں کو دیکھتے دیکھتے اُن سے بالکل جی بھر جاتا ہے۔ آپکو پیسے کا زیادہ خیال تو نہیں ہونا چاہیئے۔"
"ہاں زیادہ تو نہیں ہے۔ مگر کم خیال تو ضرور ہو سکتا ہے ! لیکن آپ نے یہ بات خوب کہی۔ بھلا پیسے اور مٹھائی سے کیا مناسبت۔ ماسٹر صاحب قبلہ اِن دونوں میں تو زمین آسمان کا فرق ہے۔ آدمی کی نیت مٹھائی سے ضرور سیر ہو سکتی ہے لیکن پیسے سے نہیں۔ کوئی بڑے سے بڑا سیٹھ ساہوکار بھی اپنے سرمایہ سے مطمئن نہیں ہوتا اور بیش بادکی دُعائیں مانگتا رہتا ہے۔ جناب پیسہ چیزے دیگر است۔ کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ جس شخص کو پانچہزار ملتے ہوں اُسکے لئے چھ ہزار کوئی کشش نہیں رکھتے۔ نہیں قبلہ ایکہزار کا اضافہ بہت ہوتا ہے۔" راشد نے ایک عجیب آگہی کے زعم کے ساتھ کہا۔
فاضل اِس عارفانہ تقریر کو سُن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ بیس اور چھ ہزار میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ اُسکے خیال کا منتہیٰ اُسوقت محض بیس ہی روپیہ تھے۔
"راشد صاحب دیکھیئے میں اسوقت آپ سے ایک خاص بات کہنی چاہتا ہوں ! میں آج ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" فاضل نے پھر اپنے موضوع کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
"ماسٹر صاحب آپ ایسا روکھا چہرہ بنا کر بات نہ کیا کیجئے۔ آپ کی

اس سنجیدگی کو دیکھکر میرے ہوش اُڑتے ہیں۔ .... اچھا آپ پہلے ہماری روداد سُن لیجئے!" راشد نے دوبارہ قطع کلام کرتے ہوئے اپنی مخصوص دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

فاضل جانتا تھا کہ اُسے راشد کی روداد نہیں بلکہ اپنی قسمت کا فیصلہ سُننا پڑے گا۔ اب محرومی اُس کی نظروں کے سامنے موجود تھی۔ اُسے یقین سا تھا کہ راشد اب جو کچھ بھی کہے گا وہ اُسکے اپنے مقصد کے منافی ہوگا۔ اس سے پہلے بھی بارہا ایسے مواقع پر اُسمیں ایسی ہی پیغمبرانہ بصیرت پیدا ہوئی تھی۔ پھر بھی جس طرح ایک مجرم کو بہرحال فیصلہ سُننا ہی پڑتا ہے اُس نے بھی بُت بنکر راشد کی روداد سُننی شروع کردی۔

"ماسٹر صاحب کل بہت حیلے حوالوں سے ہم امّی جان سے بیس روپیہ وصول کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے ——— منشی جی سے مانگ ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ اِس معاملہ میں بہت سخت ہیں اور مہینے کا خرچ دینے کے بعد وہ گویا پیسے کے معاملہ میں کچھ سُن ہی نہیں سکتے ——— ہاں تو بہ مشکل تمام بیس روپے حاصل کئے تھے ——— بس رات جب اقبال چلے گئے تو شمیم اُٹھے اور میرے کپڑوں کی تلاشی لینے لگے۔ اُنہوں نے میری شیروانی کی جیب میں سے دونوں نوٹ نکال لئے اور میں لاکھ بنتا اور بگڑتا رہا لیکن وہ یہ کہکر چلدیئے کہ مجھے تم سے زیادہ ضرورت ہے۔ بس اب وہ دہلی جائینگے اور چند گھنٹوں میں بیس روپیہ پھونک کر چلے آئیں گے۔ میں آج ایک فاؤنٹین پین خریدنے کی فکر میں تھا۔ اُسی دن رشید صاحب نے وعدہ لے لیا تھا کہ "ماتا ہری" دیکھنے کے لئے

چلنا پڑیگا۔ لیکن اب ....

فاضل اپنی قسمت کا فیصلہ سُن رہا تھا اور اُس کے چہرہ پر ایک مُردنی سی چھائی جا رہی تھی۔۔ ایک مسکراہٹ بھی اسی مُردنی میں دوڑ رہی ہوئی تھی ایسی مسکراہٹ جو کسی غریب دیندار کے چہرہ پر مرتے وقت اس خیال سے دوڑ جایا کرتی ہے کہ شاید مرنے کے بعد اُسے دُنیا کی تمام مصیبتوں کا اجر مل جائے۔ لیکن جس طرح ایک مجرم کے قلب و دماغ کا توازن پھانسی کی سزا سُنکر خراب ہو جاتا ہے اسی طرح فاضل کی حالت بھی رفتہ رفتہ دگرگوں ہوتی گئی۔

"کیوں خیر تو ہے ماسٹر صاحب۔ آپ کے چہرہ کی رنگت تو بالکل زرد پڑ گئی۔ آپ کی طبیعت کچھ ناساز معلوم ہوتی ہے ——— دیکھئے میں کچھ بندوبست کرتا ہوں۔۔۔۔۔" راشد نے فاضل کے مرجھائے ہوئے چہرہ پر نظریں جماتے ہوئے گھبرا کر کہا۔ اور وہ پریشان سا کوٹھی کی سمت یہ کہتا ہوا چلدیا ———

"ماسٹر صاحب آپ یہاں سبزہ پر بیٹھ جائیے۔ میں ابھی آتا ہوں۔ آپ پر گرمی کا بہت اثر پڑا ہے مجھے ڈر ہے کہ کہیں ...."

فاضل کچھ جواب میں کہنا چاہتا تھا لیکن اُسکے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے وہ وہیں ایک درخت سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اُسے تمام باغ گھومتا نظر آ رہا تھا اور ایک راشد کے بجائے اُسے کئی راشد اپنی طرف مڑ مڑ کر دیکھتے نظر آ رہے تھے۔ وہ اپنی تمام قوتیں اپنی حالت کو اعتدال پر لانے میں صرف کر رہا تھا۔

راشد کوٹھی میں داخل ہو گیا تھا اور فاضل لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے کوٹھی کے باغ کے دروازہ سے یہ شعر گنگناتا ہوا نکل رہا تھا۔

گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو
ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

ڈاکٹر نیگی

ڈاکٹر نیگی اپنے ہی شہر میں مشہور نہ تھا بلکہ اُسکا شہرہ دُور دُور تک تھا۔ اُس کی تشخیص کا ہر شخص قائل تھا۔ جسے دیکھو یہی کہتا نظر آتا تھا "اجی ڈاکٹر نیگی کی تشخیص کے کیا کہنے"۔ اور اُس کا وسیع اخلاق گویا سونے پر سہاگہ تھا جو مریض ایک مرتبہ اُس کے یہاں پہونچ گیا عمر بھر کے لیئے اُس کا مرید ہو گیا۔ وہ اپنے مریضوں سے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتا، نہایت غور و خوض سے اُنہیں دیکھتا اور ہر طرح اُنکی تسلّی و تشفّی کرتا۔

اُسکے اوصاف کا چرچا دن بدن بڑھتا گیا اور اُس کی ڈاکٹری دن دُونی رات چوگنی ترقی کرتی گئی۔ جسقدر اُسکا کاروبار بڑھتا گیا اُسی مناسبت کیساتھ اُس کے ٹھاٹھ بھی بدلتے گئے۔ یہاں تک کہ مریضوں کی کثرت کی وجہ سے اُسے ایک بڑی عالیشان عمارت لینی پڑی۔ ابتدا میں تو وہ مریضوں کو دیکھنے تانگہ ہی میں جایا کرتا تھا اور بسا اوقات پیدل بھی چلا جاتا تھا لیکن کام کے ترقّی پا جانے کے بعد اُس کا وقت اسقدر قیمتی ہو گیا کہ وہ موٹر کے بغیر مریضوں کو دیکھنے نہ جا سکتا

بہت جلد ہی اُس نے اپنی کمائی ہوئی دولت سے شہر کے سب سے پُر فضا علاقہ میں ایک نہایت خوشنما کوٹھی بنوائی اور اُس کا شمار شہر کے

بڑے ڈاکٹروں میں ہونے لگا۔

یہ سب کچھ ہوا لیکن ڈاکٹر نیگی کی دو باتوں میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ وہ بدستور مریضوں کو نہایت توجہ کے ساتھ دیکھتا رہا اور اُس کا اخلاق بھی اُسی طرح قائم رہا۔ لوگوں کے بقول اُس میں رعونت نام کو پیدا نہ ہوئی۔

حسب معمول ڈاکٹر نیگی کا بڑا کمرہ مریضوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا وہ ایک ایک مریض کو نمبر وار بُلاتا، بہت غور سے اُس کو دیکھتا، اُسکا حال سُنتا اور نسخہ لکھ دیتا۔ اِس تمام مصروفیت کے دوران میں وہ برابر مُسکراتا رہتا۔

رام پرشاد، اُس نے پکارا اور ایک بظاہر ہٹا کٹا مریض اُس کی جانب بڑھا۔ ڈاکٹر نیگی نے مسکرا کر مریض کی جانب دیکھا اور اُسے ہاتھ کے اشارے سے بُلاتے ہوئے اُس بنچ کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا جس پہ وہ مریضوں کو لٹا کر دیکھتا تھا۔ مریض کچھ ٹھٹکا اُس کے مُنہ سے نکلا۔

"ڈاکٹر صاحب! میں۔۔۔۔۔" وہ اور بھی کچھ کہتا لیکن ڈاکٹر نے مُسکراتے ہوئے ہاتھ کے اشارہ سے خاموش کرتے ہوئے کہا "میں سب سُن لوں گا بعد میں! آئیے ذرا لیٹ جائیے! پہلے میں دیکھ لوں آپ کو!" یہ کہکر اُس نے (Stethoscope) اسٹیتھواسکوپ کو جو اُس کے گلے میں پڑا ہوا تھا جلدی سے کانوں میں لگا لیا۔ "آئیے! آئیے! جلدی آئیے!!" ڈاکٹر نے دوبارہ مسکراتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر کا لہجہ خوشش آیند ہونے کے باوجود تحکمانہ تھا۔

مریض بڑھا اور کچھ تامل کے ساتھ بنچ پر لیٹ گیا۔ ڈاکٹر نے قمیص

اُٹھاکر مریض کے سینہ کو اسٹیتھواسکوپ سے خوب اچھی طرح دیکھا۔ پھر بٹھاکر کمر کو خوب دیکھا بھالا۔ سینہ پر اور کمر پر جگہ جگہ اپنی انگلی رکھکر دوسرے ہاتھ کی انگلی سے خوب ٹھوکا بجایا۔ پھر چت لٹاکر اُسکے گھٹنے سُکیڑکر اُسکے پیٹ کو اچھی طرح ٹٹولا۔ وہ اس دوران میں برابر مسکراتا رہا۔ اُس نے اسٹیتھو کو اپنے کانوں سے نکال لیا اور نبض دیکھنے کے لئے مریض کا ہاتھ تھاما۔ مریض کے مُنہ سے اک آہ نکلی۔ ڈاکٹر ذرا ٹھٹکا۔ لیکن پھر مُسکراتے ہوئے اُس نے نبض پر انگلیاں رکھ کر گھڑی دوسرے ہاتھ میں لیکر نبض کی رفتار دیکھنے لگا۔ جب ڈاکٹر نے عجلت کے ساتھ دائیں ہاتھ کو چھوڑکر بائیں ہاتھ کو تھاما تو پھر مریض کے مُنہ سے اک آہ نکلی۔ لیکن ڈاکٹر اپنے کام میں بدستور منہمک تھا۔ نبض کے بعد اُس نے مریض کو بٹھاکر اُس کی آنکھوں کو چیر چیر کر دیکھا اُس کی زبان نکلوا کر دیکھی اور سب کچھ دیکھنے کے بعد مسکراکر مریض سے کہا۔ "اب فرمائیے! آپ کو یہ شکایت ہے کتنے عرصہ سے!"

ڈاکٹر صاحب میرے ہاتھ میں پرسوں ایک پھانس چُبھ گئی تھی.....؟" مریض نے جھینپی ہوئی ہنسی ہنستے ہوئے کہا اور اپنا سوجھا ہوا انگوٹھا ڈاکٹر کے سامنے کر دیا۔

"پھانس چُبھی تھی!! آپ نے پہلے سے کیوں نہ بتایا!!" ڈاکٹر نے متعجّبانہ انداز میں ہنستے ہوئے مریض کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

دوسرے کمرہ میں دو مریض ایک دوسرے سے بات چیت کر رہے تھے

"صاحب۔ ڈاکٹر صاحب کی تشخیص خوب ہے!"
"اور طبیعت کیسی شگفتہ پائی ہے!"

شاہد کی ڈائری

۱۱ر دسمبر ۱۹۴۱ء

وہ مجھ سے قریب تھے ــــــــ وہ جو میری تمنّاؤں کی جان ہیں جن کا خیال میری زیست کا سامان ہے۔ میں لیٹا تھا اور وہ میرے پاس بیٹھے ہوئے مجھ سے پیار کے انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ میں اُن کی باتیں سُن کر اپنے آپے میں نہ تھا۔ بار بار دل میں آتا تھا کہ اپنے سینہ سے لگا لوں۔ لیکن ہمّت نہ ہوتی تھی۔ مسہری پر بچھی ہوئی چادر کے ایک پھول پر اُن کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔ باتیں کرتے کرتے اُنھوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور میرے ہاتھ کی انگلیوں سے کھیلنا سا شروع کر دیا۔ میری حیرت اور مسرّت کی کوئی انتہا نہ رہی اور میں نے محسوس کیا کہ میں کچھ مدہوش سا ہوا جا رہا ہوں۔ وہ خاموش تھے اور میں بھی۔ دفعتاً اُن کی جھکی ہوئی آنکھوں سے دو گرم گرم آنسو میرے ہاتھ پر ٹپک پڑے۔ میں بے اختیار ہو کر اُٹھ بیٹھا اور فرطِ اضطراب میں اُنھیں اپنے سینے سے لگا لیا۔ مجھ پر ایک سُکر کا سا عالم طاری تھا۔ اپنے دل کی دھڑکن کے ساتھ ساتھ مجھے اُن کی دھڑکن کا بھی احساس تھا۔ اُنھوں نے میری گرفت سے نکل کر مسہری کی پٹیوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور چھت کی جانب ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے۔ اُنھوں نے ایک سرد آہ بھری۔ میں بیتاب ہو گیا۔

"کیا بات ہے مجھے کیوں نہیں بتاتے تم" میں نے لجاجت سے کہا۔ اُنہوں نے اشک آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بے اختیار ہو کر ایک چیخ ماری۔ میں چونک پڑا.........

الارم نہایت تیزی کے ساتھ بج رہا تھا۔ جی میں تو یہی آیا تھا کہ ٹائم پیس دے ماروں لیکن پھر ضبط کیا۔ بجائے بستر سے نکلنے کے میں نے لیٹے ہی لیٹے الارم بند کیا اور پھر آنکھیں میچ لیں تاکہ نیند آجائے اور میں پھر خوابوں کی اُسی حسین دُنیا میں پہونچ جاؤں جہاں وہ....... وہ میرے پاس ہوں...... لاکھ کوشش کی لیکن مطلق آنکھ نہ جھپکی۔ اگرچہ رات کو یہ طے کیا تھا کہ صبح کو بلاناغہ پانچ سے آٹھ تک پڑھا کروں گا لیکن اس خواب نے مجھ میں کچھ ایسی ہیجانی کیفیات پیدا کر دی تھیں کہ پڑھنے کو قطعی جی نہ چاہا۔ اُن کے خیال میں غرق پڑا ہوا کروٹیں بدلتا رہا۔ یہاں تک کہ کوئی سات بجے عزیز نے آکر دروازہ کھٹکھٹایا۔ یہ بیچارے مجھ پر بُری طرح سے گرویدہ ہیں۔ گھنٹوں میرے پاس بیٹھے مُنہ تکا کرتے ہیں اور ٹھنڈی سانسیں بھرا کرتے ہیں۔ اپنی محبّت کا اظہار اگرچہ بہت کم کرتے ہیں۔ لیکن جب کرتے ہیں تو ایسے آرٹسٹک انداز میں کرتے ہیں کہ سہگل اور بروا کا ایکٹنگ ان کے آگے ہیچ معلوم ہونے لگتا ہے۔ جو کچھ کہتے ہیں ایسے لطیف اور بلند پیرایہ میں کہتے ہیں کہ میں متأثر ہو ہی جاتا ہوں۔ آج ایک نظم لکھ کر لائے تھے۔ عنوان تھا "تیری یاد" خوب نظم تھی۔ کہتے تھے کوئی رات کے دو بجے بیٹھ کر لکھی تھی۔ دیکھئے اگر ان کے عشق کی یہی کیفیت رہی تو یہ خود کچھ بنیں یا نہ بنیں کم از کم

مجھے تو زندۂ جاوید بنا ہی دینگے۔ ان کی موجودگی ہی میں پروفیسر صاحب کا ملازم آیا وہ تو یہ کہہ کر چلا گیا "صاحب بلاتے ہیں آپ کو" اور عزیز کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ چہرہ کا رنگ تمتما اٹھا ایک طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولے "جائیے آپ کو صاحب بلاتے ہیں" پھر ہنس کر کوئی فارسی کا شعر پڑھتے ہوئے ایک شان بے نیازی کے ساتھ کمرہ سے چلے گئے۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ ع

عشق است و ہزار بد گمانی

اُٹھ کر میں نے ہاتھ منہ دھویا کپڑے بدلے۔ یہ اسنو جو میں کل لایا ہوں کسقدر عمدہ ہے۔ کیسی بھینی بھینی خوشبو آتی ہے۔ کل پروفیسر صاحب بھی تو اسکی دلاویز خوشبو سے مست ہو گئے تھے لیکن وہ تو اسے میری خوشبو بتلاتے تھے کہتے تھے "کسی دُنیا کے اسنو میں ایسی خوشبو ہرگز نہیں ہو سکتی، شاہد اس کی خوشبو تمہاری ہم نشینی کا اثر ہے!" لوگ بھی کیسی کیسی مبالغہ آرائیاں کیا کرتے ہیں۔ پروفیسر صاحب کے ہاں کوئی دو گھنٹے بیٹھنا پڑا اُنکی باتوں سے مجھے سخت اُلجھن ہوتی ہے وہی پُرانی باتیں اُلٹ پھیر کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ لوگ باگ انہیں بہت قابل بتاتے ہیں۔ میں بھی ابتدا میں انہیں کچھ ایسا ہی سمجھا تھا لیکن اب تو میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ یہ قابلیت ان کو چھو کر بھی نہیں نکلی۔ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا تو یہ میرے حُسن کی تعریف میں شاعری شروع کر دیتے ہیں۔ میری چھوٹی سچی تعریفیں کرنے لگتے ہیں۔ جب کبھی یہ ایسی باتیں کرتے ہیں تو مجھے عزیز کی سُنائی ہوئی اُن کی تمام ماضی کی داستانیں یاد آ جاتی ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ ایسی باتیں انہوں نے

نہ معلوم کتنے لوگوں سے کی ہوں گی۔ لیکن پھر بھی ان کی باتیں سُنکر مجھے ایک گونہ مسرّت ہوتی ہے۔ کون شخص اپنی تعریف سُننی نہیں چاہتا اور وہ بھی ایک پروفیسر کی زبانی۔

ان کی بدولت آج میں پہلے تینوں گھنٹے (attend) نہ کرسکا۔ ان کا بیجا التفات مجھے کسقدر نقصان پہونچا رہا ہے لیکن جب یہ رومان میں ڈوبے ہوتے ہیں تو اس سود و زیاں کی دُنیا سے بہت بالا ہوجاتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا پروفیسر صاحب کے ساتھ ہی کھایا۔ اور پھر چونکہ پانچویں گھنٹے میں شریک ہونا ضروری تھا اسلئے بصد اصرار اجازت حاصل کی چلتے وقت پروفیسر صاحب نے "مرقع چغتائی" مجھے بطور تحفہ کے پیش کیا اور کہنے لگے

"گر قبول افتد زہے عزّ و شرف"

پروفیسر صاحب کی عنایتیں میرے حال پر دن بدن فزوں ہوتی جارہی ہیں۔

کالج پہونچا۔ کمرہ میں داخل ہوتے ہی اُن سے نظریں دو چار ہوئیں۔ مجھے دیکھکر کچھ شرماسے گئے۔ حُسن انفاق سے اُن کے نزدیک والی کُرسی خالی پڑی تھی۔ میں ہمت کرکے اُسپر جا بیٹھا۔ میں اُن کے پاس جا تو بیٹھا لیکن میری عجیب کیفیت تھی۔ دل بلّیوں اُچھل رہا تھا۔ اِن کی دوری میں تو میرا بُرا حال رہتا ہی ہے لیکن قربت بھی کچھ کم قیامت خیز نہیں ہوتی۔ خُدا کا لاکھ لاکھ شُکر ہے کہ آج انھوں نے مجھ سے کچھ بات تو کی ۔۔۔

لائے اُس بت کو التجا کرکے کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے

میرے رات کے خواب کی تعبیر مل گئی کیا خوب بات ہے کہ دُنیا تو مجھ پر مرتی ہے اور میں ان پر جان نثار کرتا ہوں۔ میں سوچتا تھا کہ آخر میرا حُسن و جمال ان پر کیوں اثر انداز نہیں ہوتا۔ میں ان کے غُرور و ناز' کو توڑنے کے درپے تھا۔ بالآخر میں کامیاب ہوا۔ آج کا گھنٹہ چشم زدن میں گذر گیا۔ باقی دن ہنسی خوشی گذرا۔ میں فرطِ مسرت سے پھولا نہ سماتا تھا۔ عزیز ملے تو کہنے لگے "آج تو ہونٹوں پر غضب کا تبسّم کھیل رہا ہے۔ کیا کسی نئے شکار کو پھانسنے کی تیاری ہے"
میں نے جواباً یہ شعر پڑھا۔ ؎

ہنس کر جو کبھی بات وہ کر لیتے ہیں مجھ سے   پہروں میرے چہرہ سے بحالی نہیں جاتی

شام کو پروفیسر صاحب نے بلا بھیجا۔ دو تین گھنٹوں میں پیچھا چھوڑا۔ شام کا کھانا بھی انہیں کے ہمراہ کھایا۔ اپنے کمرہ میں آکر کتاب کھول کر پڑھنے کے خیال سے بیٹھا ہی تھا کہ جمال آگئے۔ کچھ دیر بعد عزیز بھی آگئے۔ جمال کے اصرار پر یہ طے ہوا کہ سینما چلیں۔ آج کل "رمولا" جمال کے خوابوں کی رانی بنی ہوئی ہے اسلئے "قیدی" پکچر دیکھنے پہونچے۔

پکچر نہایت تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِس افسانہ کو لکھنے والے کے دماغ میں بھُس بھرا ہوا ہے۔ شاید اس نے اپنی تمام عمر نوحوں اور مرثیوں کے پڑھنے میں تیر کی ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے! فلم دیکھنے کا مقصد یہ تھوڑی ہے کہ ہم اداکاروں کے مصنوعی رنج و غم اور عشق و محبت کی فرضی المناکیوں سے متأثر ہو کر رو رو کر اپنی جان کھو دیں۔ میرے نزدیک تو اس پکچر کی املا غلط، انشا غلط، غرض سب کچھ غلط تھا۔

لیکن باوجود اِس کے رقیق القلب انسان بعض لغو اور بے معنی مناظر کو دیکھکر آٹھ آٹھ آنسو رو رہے تھے۔ ٹھنڈی سانسوں کی سائیں سائیں سُنکر مجھے اسقدر وحشت ہو رہی تھی کہ کئی بار تو یہ جی میں آیا کہ اُٹھکر بھاگ جاؤں۔ لیجئے جناب گئے تھے اِسلئے کہ دو گھڑی دل بہلائیں گے وہاں ایک عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ بھلے آدمی نے ایک کو بھی تو زندہ نہ چھوڑا۔ سب کا صفایا کر کے دم لیا۔ بعض افسانہ نویس بھی کتنے احمق ہوتے ہیں۔

سینما ہاؤس سے نکلتے ہی جمال نے اپنی تنقید شروع کر دی۔ یہ حضرت اپنی تمام طباعی فلموں پر تنقید و تبصرہ کرنے میں صرف کر دیتے ہیں۔ رمولا کی اداکاری کے علاوہ انھیں فلم میں کوئی بات اچھی نہ نظر آئی۔ نہ ڈائریکشن صحیح تھا نہ افسانہ کا پلاٹ کچھ جاندار تھا۔ رمولا کے علاوہ باقی تمام اداکاروں کے کام بھی انہیں پسند نہ آئے۔ نندرکر پر انہوں نے خوب پھبتیاں اُڑائیں۔ خوب قہقہے لگائے۔ واقعی کمبخت نے کیسا تن و توش چھوڑا ہے۔ چلنا دو بھر ہو رہا ہے۔ نہ جانے کس چکی کا پسا ہوا کھانے لگا ہے۔ ابھی کل کی سی بات ہے کہ "باغبان" فلم میں یہی ایک چھریرے جسم کا پھرتیلا سا نوجوان تھا، اور آج! خدا کی پناہ! توپ ہو رہا ہے توپ!!

عزیز پر اس فلم کا نہایت گہرا اثر پڑا۔ وہ سینما سے ہوسٹل تک خاموش آئے۔ صرف ایک مرتبہ جمال کے چھیڑنے پر یہ شعر پڑھ دیا۔ ؎

قیدِ ہستی کا اسدؔ کچھ نہیں جُز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

بس انہیں تو ہندوستان کی تیرہ بختی کے تمام مناظر اسی فلم میں نظر آ گئے
ہوں گے۔ کھیل کے شروع میں تو خیر یہ کچھ دیر تک میرے ہاتھ سے بیٹھے کھیلتے
رہے لیکن پھر ایسے بُت بنے کہ محبّت و جنّت سب بھول گئے۔ اب کئی دن
تک آپ کے دماغ پر اصلاح کا بھوت سوار رہے گا۔ تمام دوستوں کو لیکچر
دیتے پھرینگے۔ لیکن یہ سب جوش و خروش چند دن کا ہوگا پھر یا تو اور بھی زندت
کے ساتھ عشق کرنے میں مصروف ہو جائیں گے یا برج کھیلنے میں۔ ان کے عشق
سے بس خدا محفوظ رکھے

چونکہ سیکنڈ شو دیکھی تھی اسلئے کوئی ساڑھے بارہ بجے واپسی ہوئی۔
پروفیسر صاحب اس غضب کی سردی میں بھی باہر ٹہل رہے تھے۔ اُنہیں دیکھتے
ہی جمال نے مجھ پر فقرہ کسا۔ بولے "ذرا تو خوف خدا دل میں لاؤ۔ دیکھتے نہیں
تمہارا الامکانی عاشق اس ٹھنڈ میں کس بے صبری سے تمہارا انتظار کر رہا ہے"۔
میں چاہتا تھا کہ کسی طرح پروفیسر صاحب سے بچ نکلوں لیکن وہ یوں کب
جانے دیتے ہیں۔ مجھے بلایا اور کہنے لگے "شاہد کہاں گئے تھے" میں نے کہا
"تماشہ میں چلا گیا تھا"۔ فوراً مسکرا کر یہ شعر پڑھ دیا۔ ؎

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو   تو کجا بہرِ تماشہ میروی

پھر اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ بڑی مشکل سے رہائی نصیب
ہوئی۔ ان کا عشق بھی میرے لئے عجیب بلائے بے درماں ثابت ہو رہا ہے۔ کچھ
کرتے بن نہیں پڑتی۔ ایک پروفیسر کو عشق کرنے میں جتنی سہولتیں میسّر ہوتی
ہیں شاید کسی دوسرے انسان کو نہیں ہو سکتیں۔ سب لڑکے مجھ پر انگشت نمائیاں

کرنے لگے ہیں۔ ہر ایک مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھتا ہے لیکن انکی بلا سے۔
عجب آفت میں جان پھنسی ہے۔ ابتدا میں تو میں ان حضرت کو ایک نہایت
معقول اور ذی لیاقت انسان سمجھتا تھا۔ ان کی باتوں میں جو رندانہ شوخیوں
کی جھلکیاں نظر آتی تھیں انہیں میں ان کے جمالیاتی ذوق پر مبنی سمجھتا تھا۔
لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ حضرت اتنے بڑے قلندر ہیں۔ انکی صوفیائی عاشقی
کے تیور اگر مجھے شروع ہی میں معلوم ہو جاتے تو میں ہرگز اس معاملہ کو اتنا
طول نہ کھینچنے دیتا۔ ان کا تو بس نہیں چلتا ورنہ قیس و فرہاد سے بھی بازی
لیجائیں۔ دیکھئے کیسے رہائی نصیب ہوتی ہے۔ عزیز تو کبھی کبھی ایک طنز کے
ساتھ مجھے یہ شعر پڑھ کر سُنایا کرتے ہیں۔ ؎

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

لیکن یہ حضرت عزیز خود کیا کچھ کم ہیں۔ یہ اگر پروفیسر ہوتے تو نہ جانے
کیا رنگ دکھاتے۔ امتحان سر پر کھڑا ہے اور ابھی تک میں قطعی کورا ہوں۔
خیر ویسے ہے تو (Home examination) نجی امتحان اور پھر آخر
پروفیسر صاحب کس کام آئینگے۔ کوئی جنت میں تھوڑی ہی بخشوائیں گے۔
اسوقت ٹھیک دو بجے ہیں۔ نیند میری آنکھوں میں اُڈی چلی آرہی ہے۔

۱۹ردسمبر

رات پروفیسر صاحب نے ہوسٹل کے چند ماہرین موسیقی کو بلا کر
محفل رقص و سرود جمائی تھی۔ ہر لڑکے نے بے حجابانہ اپنے اپنے کمالات کا

اظہار کیا مہرا اقرار تھا انکار کے بعد خوب خوب ناچے ایک تو ان حضرت کی کمر ویسے ہی بل کھاتی رہتی ہے لیکن ناچتے وقت تو انکی کمر نے غضب ہی کر دیا۔ لڑکوں نے جو اصرار کیا کہ پروفیسر صاحب دوپٹہ اوڑھا دیجئے۔ پروفیسر صاحب نے فوراً گھر میں سے اپنی لڑکی کا دوپٹہ منگواکر مہرا کو دیدیا۔ ویسے ہی بقول جوش ان حضرت نے "نسوانیت سے ہر شیریں ادا چھین لی ہے" اسپہ دوپٹہ اوڑھکر گھونگھٹ نکال کر یہ گانا" پتلی کمریا موری بل کھائے رے " ایک عجیب کیفیت تھی۔ ہر لڑکا کیف وسرور کے عالم میں غرق تھا۔ بے حجابیوں کی منزلوں سے گذر کر سب بدمستیوں کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ خود پروفیسر صاحب نے ایک مرتبہ مہرا کو ایسے انداز میں مخاطب کیا کہ وہ کچھ جھینپ سا گیا۔ رات کے دو بجے تک وہ دھما چوکڑی مچی رہی کہ بس توبہ ہی بھلی۔ یہ سب کچھ پروفیسر صاحب کے نزدیک لبرل ایجوکیشن ہے۔ خدا خدا کر کے کوئی تین بجے نیند آئی۔ اُٹھا تو نو کا عمل تھا۔

بے وقت سونے کا اثر میری طبیعت پر بہت بُرا پڑتا ہے۔ چنانچہ سر میں کافی درد ہو رہا تھا۔ آج کالج جانے کو دل نہ چاہا۔ دہلی سے اخلاص صاحب کا خط آیا۔ شکووں اور شکایتوں سے لبریز۔ بس اگر ہر دوسرے تیسرے دن ان کے دفتروں کا جواب دفتروں کی صورت میں دیتا رہوں تو تو خوش ہیں ورنہ لکھکر بھیجیں گے۔ ع۔ موم سمجھے تھے ترے دل کو سو پتھر نکلا۔ جب ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ دوسرے اُس کی مرضی کے مطابق کام کریں تو پھر میں بھی یہی کیوں نہ چاہوں۔ میرے دل میں بھی جو آئیگا وہی کروں گا۔ میں ہرگز دوسروں کا

پابند نہیں بن سکتا۔

ایک وہ عزیز ہیں۔ میرا اور شمیم کا ملنا انکی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔ صاف صاف تو کچھ نہیں سکتے البتہ اپنی خفگی تیوروں سے ضرور ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ کل آئے کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہے میں نے جو کہا

ع۔ کچھ ہنسو بولو خدا کیواسطے

فوراً ایک ٹھنڈی سانس بھر کے بولے" افسوس! شاید تم مجھے نہ سمجھ سکے! میں نے تمسخرانہ انداز میں اس بے معنی اور لغو جملہ کی وضاحت چاہی۔ فوراً بپھر گئے۔ کہنے لگے" شاہد بس مجھے زیادہ نہ چھیڑو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں بھڑک اُٹھوں۔ میرے سینہ میں جو آگ دبی ہے کہیں وہ شعلہ فشاں نہ ہو جائے۔۔۔۔"

وہ اور نہ جانے کیا کیا فارسی بولتے مگر میں نے خود ہی روئے سخن بدلدیا بس ذرا کسی کو مُنہ لگانے کی دیر ہے پھر تو لوگ باگ ایسے ایسے گرگٹ کے سے رنگ بدلتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔

پروفیسر صاحب کوئی دس بجے میرے کمرہ میں تشریف لے آئے۔ اب ان حضرت نے یہ سنبھالی ہے کہ اگر میں ان کے ہاں نہ جاؤں تو یہ خود میرے ہاں آکر براجمان ہو جاتے ہیں۔ کچھ دیر تک بیٹھے ہوئے میری تصویروں کا البم دیکھتے رہے پھر مجھے اپنے ہمراہ اپنے دیوان خاص میں لے گئے۔ آج کا تمام دن بھی قریب قریب انہیں کے یہاں گذرا۔ ایک صاحب کہیں باہر کے تشریف لائے تھے۔ پروفیسر صاحب کی قابلیت کا شُہرہ اِن کے کانوں تک بھی پہونچ گیا ہوگا۔ کھدّر کے نئی وضع قطع کے کپڑوں میں ملبوس، بال ایک نہایت

مرعوب کُن انداز میں بڑھائے ہوئے۔ وہ پروفیسر صاحب کو اپنی شخصیت سے مرعوب کرنے کی کوشش فرماتے رہے اور پروفیسر صاحب نہایت اطمینان سے اپنی لیاقتوں کا سکہ اُن پر جماتے رہے۔ ہر نئی پرانی روش پر تنقید کرنا بلکہ ہر اُس شئے پر تنقید کرنا جو دوسرے نے پیش کی ہو پروفیسر صاحب کی فطرت ثانیہ بنکر رہ گیا ہے۔ مجھے اُن کی اِس عادت سے بڑی سخت نفرت ہے۔ بہرحال یہ حضرت تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پروفیسر صاحب کی باتیں سُن رہے تھے اور دل میں سوچتے ہوں گے کہ اگر دُنیا میں صحیح معنوں میں کوئی دانائے راز پیدا ہوا ہے تو وہ صرف انہیں پروفیسر صاحب کی ذات گرامی ہے۔ باتوں باتوں میں پروفیسر صاحب اِس اناڑی کو اپنے خاص میدان میں گھسیٹ لائے۔ اقبال پر گفتگو شروع ہوگئی۔ یہ موضوع ان کا عزیز ترین موضوع ہے۔ چنانچہ گھنٹوں اقبال کی شاعری پر لیکچر دیتے رہے۔ وہ وہ اسرار و رموز بیان کئے۔ کہ خود علامہ مرحوم سنتے تو سر دُھن لیتے۔ اقبال کے پیغام عمل پر پروفیسر صاحب نے اتنا کچھ کہدیا کہ فضا پر ایک عجیب بے عملی سی طاری ہوگئی۔ تھک کر سب چائے پینے میں مصروف ہوگئے۔ بعد ازاں شراب کا ذکر چھڑ گیا۔ پروفیسر صاحب تو گویا "پیر مغاں" ٹھہرے۔ عزیز کہتے تھے کہ ایک زمانہ میں لڑکوں نے پروفیسر صاحب کو "پیر مغاں" کہنا شروع کر دیا تھا اور جب ان کے کانوں تک یہ بات پہونچی تھی تو بہت خوش ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ جس لڑکے نے یہ لقب ہمارے لئے تجویز کیا ہے وہ ضرور کوئی ذہین لڑکا ہے۔ ہاں تو شراب کا ذکر چھڑتے ہی پروفیسر صاحب جھنجھلانے لگے۔ اُٹھکر اپنے اندر کے کمرہ میں گئے وہ اکثر باتیں کرتے کرتے یوں ہی چلے جایا کرتے

ہیں۔ وہاں سے وہ مُنہ پوچھتے ہوئے آئے اور آ کر شراب کی تعریف میں وہ وہ نادر باتیں سُنائیں کہ نو وارد صاحب پر بھی بے پئے بے خودی سی طاری ہونے لگی۔

مے کہ بدنام کند اہل خرد را غلط است
بلکہ مے می شود از صحبتِ ناداں بدنام

یہ ہے پروفیسر صاحب کا نظریہ شراب کے بارے میں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہتے ہیں۔ ع ۔ چھُپ کے پینے میں مزا مجھکو سوا ملتا ہے

بارہ بجے کے بیٹھے بیٹھے کوئی چھ بجے وہ حضرت اُٹھ کر گئے۔ پروفیسر صاحب کی باتوں سے بس خدا اپنی پناہ میں رکھے۔ میں نے تو ایسا لسان آدمی دیکھا نہیں۔ شام کو کھانا کھانے کے بعد کچھ تخلیہ میسّر آگیا۔ پروفیسر صاحب نے اسے غنیمت شمار کیا۔ بہت دیر تک میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک والہانہ انداز میں حُسن و عشق کے رموز منکشف کرتے رہے۔ وہ جب کبھی ایسی باتیں کرتے ہیں۔ تو سینکڑوں اشعار سُنا جاتے ہیں ایک شعر آج آپنے مجھے بھی یاد کرا دیا۔ ؎

گر عشق نبودے و غمِ عشق نبودے
چندیں سخنِ نغز کہ گفتے کہ شنودے

کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے پھر دفعتاً اُٹھے اور میری کُرسی کے پیچھے آن کھڑے ہوئے میں احتراماً اُٹھنا چاہتا تھا لیکن انہوں نے میرے دونوں شانوں پر اپنے ہاتھوں کا زور دیکر بٹھا دیا۔ پھر کچھ ایسی مجنونانہ حرکات ان سے ظہور میں آئیں کہ میں حیران رہ گیا۔ پروفیسر صاحب دراصل چاہتے یہ ہیں کہ میرے اور ان کے درمیان سے خوردی بزرگی شاگردی اور استادی کا امتیاز اُٹھ جائے۔ میں ان سے بے تکلف ہو جاؤں میں

وہ حیثیت قبول کر لوں۔ جسمیں پروفیسر صاحب نے مجھے اول دن ہی سے سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ تو ڈنکے کی چوٹ اپنی چاہت کا اعلان کرتے ہیں اور لوگ باگ اُن کی لایعنی اور لامکانی خرافات سے اس درجہ مرعوب ہو چکے ہیں کہ اُنہیں فرشتے سے بھی بڑھ کر سمجھے ہوئے ہیں۔ اگرچہ میں انکی اس روش کا عادی ہو چلا ہوں کیونکہ میرا دل اپنی تعریفیں سُنکر بہت خوش ہوتا ہے اور پھر مجھے ان کی ذات سے فوائد بھی لاتعداد حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن جب کبھی میں سنجیدگی سے اپنی موجودہ حالت پر غور کرتا ہوں تو میں اُس گھڑی کو کوسنے لگتا ہوں۔ جب میں نے اس کالج میں آنے کا ارادہ کیا تھا میری زندگی پہلے ہی کیا کچھ کم خراب تھی اور اب تو آئے دن مجھ پر ایسے غلط اثرات پڑ رہے ہیں کہ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

پروفیسر صاحب کا ارادہ ہے کہ وہ اِن تعطیلات میں آگرہ جائیں۔ مجھے بھی ہمراہ لیجانے کی تمنا ظاہر کرتے ہیں۔ کل بھی کہتے تھے اور آج تو خوشامد تک نوبت پہونچ گئی۔ کسی کا یہ شعر مجھے پروفیسر صاحب کے عین حسب حال معلوم ہوتا ہے۔ ؎

معقول سہی وجد کا حیلہ مگر اے شیخ
اچھا نہیں با ایں ہمہ تمکین و حیا رقص

جب سے شمیم گئے ہیں۔ ایک ایک دن ایک ایک سال کے برابر معلوم ہوتا ہے۔ دیکھئے یہ چھٹیاں کب ختم ہوتی ہیں۔

جنسی تعلیم کا ایک مؤثر ذریعہ

ہم لوگوں کی عادت تھی کہ جہاں میر صاحب کو آتے دیکھا اور میدان صاف پایا۔ یعنی چچا جان موجود نہ ہوئے۔ بس فوراً ایک نہ ایک موضوع لیکر اُس پر بحث کرنے بیٹھ گئے۔ میر صاحب اور آنے والوں کی طرح چچا جان کی طلبی پر اصرار نہ کیا کرتے تھے بلکہ بہت اطمینان سے اپنی پُرانی وضع کی اچکن اُتار کر خاموش بیٹھ کر ہماری باتیں سُنا کرتے۔ وہی باتیں جو اُن کے ٹھپر بچپر کو بڑھایا کرتی تھیں۔ پُرانی تہذیب کی بُرائیاں اور نئی تہذیب کی تعریفیں۔

کچھ تو ہم خود میر صاحب کو اپنی باتوں میں اُس وقت تک شریک نہ کرتے تھے جب تک کہ اپنی مرضی کے خلاف گفتگو سُنتے سُنتے ان کے کان نہ پک جائیں اور کچھ وہ خود بھی دخل در معقولات کو [illegible] سب سمجھتے ہوئے بغیر دعوت کے ہماری گفتگو میں شریک نہ ہوتے تھے۔ لیکن اِن برداشت کی گھڑیوں میں جو اُن پر بنتی تھی وہ کچھ ہم ہی خوب جانتے تھے۔ ہماری باتیں سُن سُن کر وہ اس طرح بیچینی کے ساتھ پہلو بدلتے تھے گویا وہ جس جگہ بیٹھے ہیں وہاں انگارے بچھا دیئے گئے ہیں۔ کبھی وہ ہمارے [illegible] نوجوانوں

متعجبانہ انداز میں تکنے لگتے گویا ہم بہت ہی خلاف عقل باتیں کر رہے ہیں۔ اور کبھی پریشان ہو کر اپنے دائیں بائیں دیکھنے لگتے۔ چھت کی طرف ٹکٹکی باندھ لیتے یا ناک بھوں سکیڑ کر اپنی بید سے زمین پر نقشے کھینچنے لگا کرتے اُن کے چہرہ کا اُتار چڑھاؤ اُس وقت دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ اور ہر تیور اُن کے جذبات ڈروں کی ایک روشن تصویر!........ وہ دل ہی دل میں جز بز اتے اور 'ذہنی کرب میں مبتلا رہتے۔ یہ سب کچھ ہوتا مگر اُن میں لاکھ روپیہ کی ایک بات یہ تھی کہ وہ بغیر ہماری دعوت کے ہمارے مباحثے میں شریک نہ ہوتے تھے۔ اور جب ہم لوگوں کے اصرار پر وہ اپنی ناچیز رائے کا اظہار فرماتے تو پھر ایک سانس میں وہ سب کچھ کہہ بیٹھے جو انہیں کہنا ہوتا ' دوسروں کو گونگا سمجھتے ہوئے اِس یقین کے ساتھ کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہ سُننے والوں کے دل و دماغ میں نقش ہوتا جا رہا ہے۔

اُس دن کا ہمارا موضوع بحث جنسی تعلیم تھا۔ اگرچہ یہ اُن کی شان میں ایک گستاخی تھی لیکن افضل نے طے کر لیا تھا کہ وہ میر صاحب کے خیالات کی اُڑان اسی موضوع کی فضا میں دیکھے گا۔ میر صاحب کو آتے دیکھ کر افضل نے سلسلۂ گفتگو چھیڑ دیا اور اُن کے بیٹھک میں داخل ہوتے ہوتے ہم دونوں نہایت گرما گرم بحث میں مشغول تھے۔ عام طور پر ہماری اِن مصنوعی بحثوں میں ایکدوسرے کی مخالفت نہ ہوتی تھی بلکہ ایک فریق کسی قدر نرم بنجاتا اور تھوڑی بہت رواداری سے کام لیتے ہوئے اگلے وقتوں کی باتوں میں بھی مصلحت اور عاقبت بینی تلاش کرتا تھا اور دوسرا نہایت گرم بن کر اپنی انتہاپسندی کا ثبوت دیتے ہوئے تمام

پُرانی قدروں کو سر سے پاؤں تک لغو اور بیکار بتایا کرتا۔

میر صاحب حسبِ معمول علیک سلیک سے فارغ ہو کر اطمینان سے بیٹھ گئے اور ہماری باتیں سُننے لگے۔ میری اور افضل کی زبانی دو تین ہی باتیں سُنکر وہ چین بجبیں ہو گئے اور ایک عجیب کرب کے سے عالم میں پہلو بدلنے لگے۔ اُن کے چہرے کا ہر انداز زبانِ حال سے کہہ رہا تھا کہ مجھے جلد اس بحث میں شریک کرو۔ آپس میں کافی ردّ و کد کرنے کے بعد جب یہ سمجھ لیا کہ اب میر صاحب کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے اور اُن کے خیالات کی شدّت اپنی انتہا پر پہونچ گئی ہے۔ ہمنے اُنہیں بھی اپنے خیالات کے اظہار کا موقعہ دیا اور اُنہوں نے فوراً کھنکار کر حسبِ عادت اس طرح لیکچر دینا شروع کر دیا گویا اُن کے ہم خیال لوگوں کا ایک عظیم الشان مجمع موجود تھا اور اُن کی آواز پر ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا۔ افضل کی طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے۔

"میاں صاحبزادے یہ تم ہی کچھ انوکھی باتیں نہیں کر رہے ہو بلکہ اس زمانہ کا تو ہر انسان اسی طرح سوچتا سمجھتا ہے۔ یہ سب آنکھوں کے اندھے نام نین سُکھ جنہیں نئی روشنی کا انسان سمجھا جاتا ہے بالکل اسی طرح سوچتے ہیں۔ کچھ زمانہ ہی بدل گیا۔ فضا ہی خراب ہو گئی۔ آخر کو تو بیسویں صدی ہے نا۔ بس کیا کہوں اس نئی تہذیب کو وہ جو مولانا ظفر علیخاں نے کہا ہے خوب کہا ہے۔ ؎

تہذیب نو کے مُنہ پہ وہ تھپڑ رسید کر جو اس حرام زادی کا حُلیہ بگاڑ دے

لیکن تھپڑ مارے کون۔ حُلیہ بگڑے کیسے۔ جو قدیم ڈگر پر چلنے والے ہیں یا تو وہ اگلے وقتوں کے لوگ ہیں جنہیں کوئی دم خم باقی نہیں یا پھر جاہل اور ان پڑھ

انسان ہیں جنھیں الف کے نام بے بھی نہیں آتا۔ اور جتنے پڑھے لکھے لوگ ہیں وہ سب اسی نئی تہذیب پر لوٹ ہوئے جاتے ہیں۔"

میر صاحب کا انداز یا تو متکلمانہ تھا یا پھر ایک دم سے نقّادی کی شان نمایاں ہوئی اور فرمانے لگے۔

" یہ تمام "فرزندانِ تہذیب" آئے دن ہماری قدیم تہذیب کی کوتاہیوں اور خامیوں پر انگشت نمائی کیا کرتے ہیں۔ جب کبھی کوئی موقع انہیں ہاتھ لگتا ہے فوراً ایک نہ ایک رسم کے خلاف جو پشتہا پشت سے چلی آتی ہے۔ جہاد میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ ایسی رسم کے خلاف جس میں ہمیں تو بظاہر کوئی بُرائی نظر آتی نہیں بلکہ ہزار در ہزار خوبیاں نظر آتی ہیں۔ اور یہ کمبخت اُسوقت تک چین نہیں لیتے جب تک اُس رسم کی بیخ و بنیاد کو اُکھاڑ کر نہ پھینکدیں اپنی اِس نام نہاد ترقی پسندی کی خاطر وہ لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کو اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ یا تو وہ بھی اِن سرپھرے جاہلوں کی طرح اپنی عزیز از جان رسوم خیرباد کہدیں، ورنہ اُن کے فراق میں گھُٹ گھُٹ کر مرجائیں اور ان کی بلا سے۔ پرانے فیشن کے لوگ طرح طرح سے سمجھاتے ہیں۔ نشیب و فراز بتاتے ہیں۔ لیکن اس دَور کے ضدی اور ہٹ دھرم نوجوان کچھ ایسے اپنی دُھن کے پورے ہوتے ہیں کہ جو بات ایکمرتبہ ان کے ذہن میں سما جاتی ہے جبتک اسے پایۂ تکمیل تک نہیں پہونچا لیتے اطمینان کا سانس نہیں لیتے۔

" اب بقول تمہارے جنسی تعلیم کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے ۔ اول تو اس لفظ جنس کا استعمال ہی ہمارے زمانے کے سنجیدہ، مہذب اور

وضعدار لوگوں کو نہایت شرمناک معلوم ہوتا ہوگا۔ کیونکہ انہوں نے اس لفظ کو ان معنوں میں کبھی کاہے کو استعمال کیا ہوگا۔ اس لفظ کا استعمال زیادہ تر دوسرے معنوں میں ہوتا تھا۔ مثلاً یہ کہ "وہ جنس بہت نادر ہے" یا "اس جنس کا کیا نرخ ہے" اور اگر کبھی ضرورت پیش آ بھی گئی اور اس لفظ کو اُس خاص مفہوم کے ادا کرنے کے لئے استعمال بھی کیا تو موقع محل دیکھکر آنکھوں کے اشاروں سے "سرگوشیوں سے" خلوتوں میں اور وہاں بھی یہ سمجھتے ہوئے کہ "دیوار ہم گوش دارد" مگر آج کل کے نوجوانوں کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں۔ خوردی بزرگی کا مطلق لحاظ نہیں کرتے نہ یہ دیکھیں گے کہ چھوٹے بیٹھے ہیں نہ یہ کہ بزرگ موجود ہیں بس جو منہ میں آئیگا بے تکان بکنا شروع کردیں گے۔ زبان کو بالکل لگام نہیں دیتے۔ اسپہ خود کو تعلیم یافتہ سمجھتے ہیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ تم جنسی تعلیم سے محروم رہو۔ کون کمبخت تمہیں روکتا ہے لیکن بزرگوں کے نقش قدم پر چل کر۔ تنہائیوں میں بیٹھکر اطمینان سے کوک شاستر دیکھو اور جو جی میں آئے وہ کرو۔ اور یہی کیوں اگر ایسی ہی جنسی تعلیم حاصل کرنے کی تمنا ہے تو اپنا شرافت کیساتھ جیسے بزرگوں کا قاعدہ تھا "ارباب نشاط" میں جاکر سب کچھ حاصل کرلو۔ کیا ہمارے اسلاف اپنی ترقیوں کے عروج کے زمانے میں اس رسم کی بنیاد نہیں ڈال گئے ہیں۔ جناب بڑے بڑے شرفا اپنے بچوں کو طوائفوں کے یہاں "آداب مجلسی" سیکھنے کے لئے بھیجا کرتے تھے۔ اب "آداب مجلسی" کا تو ایک ہلکا سا پردہ تھا ورنہ وہاں سوائے جنسی تعلیم کے اور رکھا کیا تھا۔ لیکن یہ سب باتیں بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ ہوا کرتی تھیں۔ یہ

نہیں کہ لگے بہروپیوں کی طرح جنسی تعلیم کا ڈھول پیٹنے۔

"صاحب ہمیں تو آجتک کوئی آدمی پرانے فیشن کا ایسا ملا نہیں جو ان جنسیاتی معاملات میں ماہر نہ ہو۔ یہ جو موجودہ زمانہ کے زبان دراز نوجوان ہیں اور بات بات میں لیکچر دینے بیٹھ جاتے ہیں اور فلاسفہ کے غلط سلط حوالے دینے لگتے ہیں اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ ہم لوگ جنس کے بارے میں کتنا کچھ جانتے ہیں تو یہ منہ تکتے رہجائیں۔ بھلا غور کرنیکی بات ہے کہ اگر ہمارے اسلاف ان گروں سے واقف نہ ہوتے تو کیا یہ ممکن تھا کہ ایک ایک کے یہاں چار چار بیویاں رہ سکتی تھیں۔ اور جناب اُن کا تو ذکر ہی فضول ہے جنکی حرم سرائے میں سینکڑوں کنیزیں رہا کرتی تھیں۔ دُور کیوں جاؤ اب بھی ہمارے ہندوستان میں ایسی ہستیاں موجود ہیں جنکی زندگی پہ یورپ کے بڑے بڑے اُمراء رشک کرتے ہیں۔ تو کیا ان لوگوں نے باقاعدہ جنسی تعلیم حاصل کی ہے۔ اجی توبہ کیجیئے۔ بس اور تو کیا کہوں "عقلمنداں را اشارہ کافیست"۔ یہ جو یونانی حکما ہیں کوئی ان سے جا کر پوچھے کہ ہمارے بزرگ ان باتوں میں کیا مرتبہ رکھتے تھے، میاں سُنکر ہوش اُڑ جائیں ہوش! بڑے لئے پھرتے ہیں جنسی تعلیم کو۔

"اور یہ تو ہماری سمجھ میں آتا نہیں کہ جنسی تعلیم کو چال چلن اور کردار سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ کہیں گے "ہمیں جنسی تعلیم بہت باقاعدہ طور پر سائنٹفک رو سے سکھائی جانی چاہیئے" یہ لفظ سائنٹفک خوب ان کے ہاتھ لگ گیا ہے ہم تو کبھی اسکا مطلب سمجھے نہیں۔ ہمارے بزرگ ان تمام باتوں کو ملحوظ رکھتے تھے لیکن انکی باتیں نکتوں میں پوشیدہ ہوا کرتی تھیں۔ وہ غل غپاڑہ نہیں مچاتے تھے۔ اب دیکھیئے جو طریقہ انہوں نے جنسی تعلیم دینے کا ایجاد کیا اُس تک کبھی آپ کا ذہن بھی نہ پہونچا ہوگا لیکن آپ غیر ارادی طور پر کیا کچھ نہ جان گئے۔ ہمارے یہاں

بہت سے دُوراندیش شرفا ایسے موجود ہیں جو اپنے بچّوں کو شروع میں ہی شعور و بلوغ حاصل کرنے سے قبل ہی اشاروں اشاروں میں سب کچھ بتا دیتے ہیں۔ ممکن ہو کہ آپ اس طریقہ کو سُنکر چراغ پا ہو جائیں اور لگیں اول فول بکنے۔ لیکن جناب اپنا تو عقیدہ ہے۔ ع

سخن برہنہ نہ گفتن کمال گویائیست

"اچھا آپ ہی بتلائیے یہ جو ہمارے شرفا غیض و غضب کے عالم میں بچوں کو بُرا بھلا کہہ دیتے ہیں کیا اُسمیں جنسی تعلیم کے ضروری عناصر نہیں پائے جاتے۔ آپ اعتراض کرینگے کہ جناب وہ تو گالیاں بکتے ہیں اور گالیاں بکنا ایک ناشائستہ فعل ہے۔ ہاں میاں ٹھیک کہتے ہو۔ بس یہی تو سمجھ کا پھیر ہے ہمنے بھی اپنے بزرگوں کی گالیاں سُنیں اور ایسی کہ معاذ اللہ۔ اب تو ایسی گالیاں دیتے بھی نہیں لیکن ہمنے کبھی اُن کے اس فعل پر حرف گیری نہیں کی۔ اور اگر کرتے تو کیا آج کو تمہاری اس بات کا جواب دے سکتے تھے۔

"حضرت پھر وہی کہوں گا کہ جو باتیں بزرگوں نے رائج کیں وہ سب کی سب مصالح پر مبنی تھیں۔ تم خود ہی انصاف سے کہدو کہ جو بچّہ ہوش سنبھالتے ہی گالیاں سُننے لگا کیا وہ جنسی تعلیم سے محروم رہ سکتا ہو وہ تمام ترکیبیں جو گالیوں میں استعمال کیجاتی ہیں وہ ایسی تعلیمی حیثیت رکھتی ہیں کہ آپکے لیکچر کے لیکچر اُن کے سامنے ہیچ ہیں۔ میاں دیا ؤں کو کوزے میں بند کر گئے ہیں وہ لوگ کوزے میں اور خوبی یہ کہ "بیک کرشمہ دو کار" جہاں لڑکوں کو اس ذریعہ سے تعلیم دیجاتی تھی وہاں چُپ چپاتے لڑکیاں بھی اس سے محروم نہیں رہتی تھیں۔ ہاں ایک بات کے ہم قائل ہیں وہ یہ کہ آجکل شرفا کے علاوہ رذیلوں اور کمینوں کے منہ پر بھی گالیاں چڑھ گئی ہیں اور اسطرح ان کا مرتبہ کافی گر گیا ہو۔ تو یہ اپنے بس کی بات تو ہے نہیں۔ اِن نیچ ذات کے لوگوں میں شرفا کی جو چیز بھی پہونچ گئی اُسکا ستیاناس ہو گیا۔"

ے

دُکھتی رگ

"بیگم صاحبہ یہ آج کل کے فقیر کیسے ڈھیٹ ہوتے ہیں۔ یہ مٹے گئے بھیک تھوڑی مانگتے ہیں زبردستی کرتے ہیں۔" فہمیدہ نے آٹا گوندھتے ہوئے بیگم صاحبہ سے کہا جو صحن میں پلنگ پر بیٹھی ہوئی چھالیاں کتر رہی تھیں۔

"ہاں میں نے تو آجتک ایسی حالت دیکھی نہ تھی۔ فقیر فقرا ہمارے زمانہ میں بھی تھے۔ بھیک اُسوقت بھی مانگی جاتی تھی لیکن اُس وقت کے فقیر ایسے نہ ہوتے تھے کہ جہاں اڑ گئے بس اڑ گئے۔ اپنی صدا لگاتے آئے اور چلے گئے اگر کسی نے کچھ دیدیا تو لے لیا ورنہ اپنا نکل گئے۔ یہ جو ہر جمعرات کی شام کو سائیں جی آتے ہیں تو دیکھتی نہیں کیسی خاموشی سے صدا لگاتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ لوگ باگ روٹی آٹا لیکر دوڑتے ہیں اور انہیں نہیں پاتے۔ آواز میں کتنا درد ہے! نہ کسی کے دروازے پر ٹھہرنا نہ کسی سے کچھ مانگنا۔ ایسے فقیروں کی دُعا بھی تو قبول ہو جاتی ہے۔ اور اب تو یہ کیفیت ہے کہ بغیر لئے ٹلتے ہی نہیں۔ یہ نہیں کہ بھئی کہدیا "برکت ہے" اور انہوں نے اپنا راستہ لیا۔ یہ تو کمبخت اڑی مار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جیسے انہوں نے کچھ جمع کر دیا ہو۔ میں تو جانتی نہیں صبح مُنہ اندھیرے سے جو تانتا بندھتا ہے تو رات گئے تک ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اب ایک کو دو۔ دو کو دو۔ لیکن اگر سارا جہاں بھیک مانگنے نکل کھڑا ہو تو لوگ باگ کہاں تک دیں۔"

بیگم صاحبہ یہ ذکر کر رہی تھیں کہ ایک فقیر کی دبنگ آواز ڈیوڑھی پر سُنائی دی۔
"بھلا کر مائی۔ بھلا کر! پیر دستگیر کا سایہ تیرے محل پر قائم رہے۔ خدا تیرے کمانے والوں کو جیتا رکھے۔ مولا مشکل کُشا تجھے دوزخ کی آنچ سے بچائیں"!!
لے فہیمن اور ذکر کر۔ دیکھا بھی تو نے ذکر کرتے ہی ٹیٹو آ لیا نا۔ آواز سے کیسا ہٹا کٹا معلوم ہوتا ہے۔ اپاہج آدمی اگر بھیک مانگیں تو کوئی ہرج بھی نہیں لیکن یہاں تو جوان ڈھوکے ڈھو مانگتے پھرتے ہیں۔ اِن کمبختوں کی بدولت جو مستحق ہیں اُنہیں بھی تو نہیں ملتا۔

"بھیج مائی بھیج۔ ایک پیسہ یا پنجہ بھر آٹا اپنے گھر کی خیرات۔ خدا تجھے ہر آفت مصیبت سے بچائے۔ اِس گھر پر پیر دستگیر کا سایہ رہے گا۔ محل دو محلے قائم رہیں گے مولا مشکل کُشا مدد کریں گے۔ بھیج۔ اللہ تیرا بھلا کرے!!".......

فہیمن ہنستی ہوئی آٹا گوندھتی رہی۔ گھر میں بچے کھیل کود میں مصروف ہے۔
بیگم صاحبہ کے سروتے کی آواز برابر جاری رہی اور فقیر کی صدا متواتر آ رہی تھی۔
"کہاں تک دئے جائیں آخر۔ خیرات کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ بس ان کے مُنہ سے تو نکل گیا" ایک پیسہ یا پنجہ بھر آٹا"۔ یہ خبر نہیں کہ اگر تھیلیاں لیکر بیٹھ جاؤ۔ تو وہ بھی دن بھر میں ختم ہو جائیں ایک ایک چٹکی آٹے میں شام تک بوریاں صاف ہو جائیں"۔ بیگم صاحبہ نے پان بنا کر مُنہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ اور پھر چھالیا کترنے میں مصروف ہو گئیں۔

"بھیج مائی سخی سے سوم بھلا جو ٹکا سا دے جواب۔ خدا تیرے گھر پر اپنی رحمت نازل کرے"۔

"بڑی رحمتیں نازل ہو رہی ہیں۔ ان کمبختوں کی دُعاؤں میں اثر بھی تو نہیں ہوتا۔ پہلے فقیر ایسے ہوتے تھے کہ جو مُنہ سے کہدیا بس وہی ہو کر رہا۔ ہونگی رحمتیں نازل۔ ساری دُنیا کی بلاؤں کا خاتمہ تو اس گھر پر ہو گیا ہے وہ رحمتوں کو لئے پھرتا ہے۔ بھاڑ میں پڑیں یہ محل دو محلے۔ اس سے تو جھونپڑوں کے رہنے والے اچھے۔ اپنا محنت کر کے کما لائے اور چین سے کھا پی کر سو رہے۔"

"کیوں مائی فقیر کا سوال پورا نہیں کرتی۔ خدا اس گھر کو ہر آفت سے بچائیگا۔ تیرا کمانے والا جیتا رہے۔ تیرا سہاگ بنا رہے۔ اللہ مددگار رہے تو بیڑا پار ہے۔ فقیر کی دُعا لے۔ پیر دستگیر تجھے اپنے سایہ میں پناہ دینگے! ......"

"اگر بد دُعائیں کر دیگا تو کون سے مُہن برس رہے ہیں کہ بند ہو جائینگے سہاگ بنا رہے' اری فہیمن کیسے مکّار ہوتے ہیں یہ لوگ۔"

"بھیج مائی فقیر آسرا لگائے کھڑا ہے۔ پیر دستگیر تجھے قرض سے محفوظ رکھیں۔ تجھے سُکھ چین نصیب ہو۔ تیرے بھائی بھتیجے جیتے رہیں۔ سائیں کی دُعا لے!...."

"یہ یوں تھوڑی جائیگا بس جان لیکر ٹلے گا۔" بیگم صاحبہ نے جل کر کہا اور ڈیوڑھی میں سے اپنے جوان لڑکے کو آتا ہوا دیکھکر فوراً دُعائیں دیتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

—"کیوں مُنّے ڈاکٹر نے کیا کہا! بخار کا بھی ذکر کیا تھا یا نہیں! ہاں ہاں گھبرانے کی کونسی بات ہے ٹھیک تو کہا ڈاکٹر نے! اچھا ایک خوراک تو ابھی پی لو۔ میں پان بناتی ہوں۔ اری فہیمن ذرا مُنّے کا بچھونا تو بچھا دے۔ جلدی اُٹھ کھڑی ہو!" بیگم صاحبہ نے اپنے کراہتے ہوئے لڑکے کے دونوں بازو تھامتے ہوئے کہا۔

"مائی فقیر کتنی دیر سے سوال کر رہے ہیں۔ مولا مشکل کشا تیری مشکل کو حل کرینگے پنجتن پاک کا سایہ تیری اولاد کے سر پر سایہ قایم رہے۔ شہزادے صاحب سلامت رہیں۔ خدا اُن کی عمر لگائے۔ یہ گھر ہر آفت اور بیماری سے محفوظ رہے!۔۔۔

"پاک پروردگار اپنی رحمت کے صدقے میں میرے منّے کو اچھا کر دے۔ آج دو سال مجھے تیرا آسرا تکتے ہو گئے۔ وہ کونسی منّت مراد ہے جو میں نے نہیں مانی بار الٰہا سُن لے۔ اپنے حبیب کے صدقے میں مجھ دُکھیا کی بھی سُن لے!" بیگم صاحبہ نے اپنے دل میں کہا۔

"مائی سائیں کا سوال بھی پورا کر دے۔ خدا تیری اولاد کو تندرستی عطا کرے۔"

"پاک بے نیاز کسی کے صدقے میں میرے منّے کی صحت بھی واپس دیدے میری دُعا بھی سُن لے۔"

"لے مائی سائیں چلدئے۔ جو دے اُسکا بھلا۔ جو نہ دے اُسکا بھی بھلا۔۔۔

"اری فہیمن بیٹھی سُن رہی ہے۔ جا کر ایک چٹکی آٹا دے کیوں نہیں آتی!" بیگم صاحبہ نے فہیمن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

مغنّی

اُس کہنہ مشق مغنّی کی باری اُس وقت آئی جب سامعین کا ذوق و شوق اپنی انتہا پر پہونچ گیا تھا۔ مجمع پر ایک عجیب کیف و انبساط کا عالم طاری تھا۔ راگ راگنیاں جو اس سے پہلے مختلف ماہرینِ موسیقی نے سُنائی تھیں حاضرین کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ بہت کچھ سُن لینے پر بھی سُننے والوں کے ذوق کی تشنگی میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ ہر ایک بیتاب تھا کہ کچھ اور سُنے ـــــ تازہ بتازہ نو بنو۔

مغنّی نے اسٹیج پر آکر تمام مجمع پر کچھ اس طرح نظریں دوڑائیں جیسے کہ وہ اُن کے دلوں کو ٹٹولتا ہو، اُس کی تجربہ کار تیز نظروں نے جلد ہی بھانپ لیا کہ کس قسم کا نغمہ اُن کے لئے فردوسِ گوش ہو سکتا ہے۔ اپنے اسٹیج پر آنے سے پہلے بھی اگر اُس کے کان ہر نئے مغنّی کی تانوں اور آواز کے زیر و بم سے لگے رہتے تھے تو اُس کی آنکھیں لوگوں کے چہروں کے اُتار چڑھاؤ دیکھنے میں مشغول رہتیں۔ وہ دل ہی دل میں لوگوں کی پسند کا اندازہ کرتا اور خوش ہوتا کہ وہ سب کو سمجھ گیا ہے۔ چنانچہ اُس نے آتے ہی اپنا ساز درست کرکے جو نغمہ چھیڑا اس نے مجمع میں ایک ہلچل مچادی۔ تحسین و آفریں کے نعرے ہر سمت سے بلند ہونے لگے۔ ہر گوشہ سے داد کی آوازیں آنے

لگیں اور رفتہ رفتہ مغنّی کی دل میں اُتر جانے والی پُرسوز آواز نے لوگوں پر کچھ ایسا جادو کر دیا کہ سب پر ایک سحر آگیں سکوت چھا گیا۔ مغنّی کی میٹھی میٹھی تانیں ساز کی نقرئی جھنکار سے مل کر سُننے والوں کے دلوں میں چٹکیاں لے رہی تھیں۔ سامعین کچھ کھوئے ہوئے سے تھے اور مغنّی کی گردن کی ہر ایک جنبش کے ساتھ اُن کے سر بھی غیر ارادی طور پر ہل جاتے تھے۔ اُس کی ہر ہر جنبش پر وردے دلوں کو لہرائے دیتی تھی۔ مغنّی اس وقت مغنّی نہیں تھا۔ بلکہ ایک ساحر جس کی سحر طرازیوں نے سب کو مست و مدہوش بنا دیا تھا۔ اُس کی آواز کے ہر زیر و بم کے ساتھ محفل میں سرور کی لہریں دوڑ جاتیں اور بزم کا ہر ہر فرد یہ محسوس کرتا کہ وہ ایک ایسے لطیف عالم میں چلا گیا ہے۔ جہاں ترنم ہی ترنم کا دَور دورہ ہے۔ جہاں نغمہ و سرود ہی زندگی کا سامان ہیں۔ جہاں سبک اور شیریں خیالات دُھن اور لے سے ہم آغوش ہو کر رقص کرتے ہیں۔ مغنّی کی آواز میں کچھ ایسا کیف بار اثر تھا کہ مجمع پر آن کی آن میں ایک سُکر کا سا عالم طاری ہو گیا۔

مغنّی اپنی کامیابی پر نازاں تھا۔ اُس کی آنکھیں جوشِ مسرت سے چمک رہی تھیں اور وہ مجمع کے دل و دماغ پر قطعی طور پر حاوی آنے کی دُھن میں لگا ہوا تھا۔ اُس کی آواز رفتہ رفتہ بلند ہونے لگی۔ انگلیاں تیزی سے حرکت کرنے لگیں۔ تاروں کی جھنکار میں اضافہ ہوا۔ اور یکایک وہ خاموش ہو گیا۔ تاروں کی جھنکار رفتہ رفتہ مدہم پڑ رہی تھی۔ مجمع پر کامل سکوت طاری تھا اور فضا میں موسیقی کی لہریں مچل رہی تھیں۔

کچھ دیر تک تو لوگ طلسم بند سے حیران بیٹھے رہے لیکن جب اُن کی آنکھیں کھلیں تو مغنّی مسرت کے آنسو پونچھ رہا تھا۔ ہر طرف سے فریاد شروع ہو گئی۔ حاضرینِ محفل کی التجاؤں کو سُن سُن کر مغنّی پھولا نہ سماتا تھا۔ بالآخر اُس نے پھر اپنے ساز کو چھیڑا۔ پھر کچھ تانیں اُڑائیں اور اس مرتبہ اُس نے اپنا محبوب ترین راگ الاپا۔ یہ راگ اگرچہ پُرانا تھا مگر اس گویئے کو اپنے فن کے کمالات دکھانے کا موقعہ اسی راگ کی دھنوں میں نصیب ہوتا تھا۔ وہ اپنی آواز اور ساز کے تمام جوہر اسی راگ کے ذریعہ ظاہر کر سکتا تھا۔ مجمع پر اعتماد رکھتے ہوئے اس نے مست ہو ہو کر اپنی فن کاری کے نمونے دکھانے شروع کر دیئے۔ لوگ بدستور کیف و سرور کی لہروں میں غرق ہو گئے۔ پھر وہی خود فراموشی اور مدہوشی کا عالم طاری ہو گیا۔ اور مغنّی ایک عالم بیخودی میں ڈوبا ہوا کیف و نشاط کی بارش کرتا رہا۔ دیر تک ایک عجیب سماں بندھا رہا۔ محفل پہ ایک سکوت کا عالم — ایک نہایت شیریں اور سحر آگیں سکوت کا عالم طاری تھا۔ سامعین کی خود فراموشی مغنّی کے فن کی کامیابی کی بیّن دلیل تھی اور اسے اُس نے پورے طور پر محسوس کیا۔ اُس نے ایک ایک کر کے وہ تمام پُرانے راگ اور راگنیاں جو اُس کی پسند کی جان تھے۔ مجمع کے روبرو پیش کرنے شروع کر دئے۔ اب اُس پر وہ کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ جہاں پہونچکر صاحب کمال دُنیا و مافیہا سب سے بے نیاز ہو کر اپنے فن میں ڈوب جایا کرتا ہے۔ اسے کچھ خبر نہ تھی اور وہ اپنی دُھن میں مست برابر شرابِ نغمہ کی بارش کر رہا تھا۔ مغنّی مست تھا اور سامعین سے زیادہ وہ

خود اپنی فن کاری سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

رفتہ رفتہ مجمع میں انتشار کی لہر دوڑنے لگی۔ سامعین تھکے ہوئے انداز میں دمبدم پہلو بدلنے لگے۔ اُن کی نیند کی گرانی سے بوجھل آنکھیں جُھکی پڑتی تھیں۔ لیکن مغنی کی لے ہنوز فضا میں مستانہ وار رقص کر رہی تھی۔

اسی مصنف کے قلم سے

روزناموں کے اوراق

زندگی کو کون کس طرح دیکھتا ہے!؟

مختلف انسانوں کی زندگی کا اک نفسیاتی مطالعہ

یہ مختصر سی کتاب مختلف انسانوں کی زندگی کا اک نفسیاتی مطالعہ ہے۔ اور موجودہ سماج جن نفسیاتی اور اخلاقی کشاکشوں میں مبتلا ہے، اس پر خود سماج کی مشینری کے خاص پرزوں، یعنی سیاست داں، عالم دین، صوفی، ڈاکٹر، فلسفی، شاعر، مزدور، سرمایہ دار، اور اسی قسم کے بعض دوسرے افراد کی زبانی ان کے روزناموں کے مختلف اوراق پیش کئے جائینگے۔ ان میں وہ خود ہی اپنی منافقت اور اخلاص کا بیان دینگے۔ اور اُن اسباب کے متعلق بحث کرینگے جو آئیڈیل انسان بننے کی راہ میں پہاڑ ثابت ہوتے رہے۔

کتاب سماج کے بکھرے ہوئے مسائل پر ایک نہایت شوخ طنز ہے، اور اس میں مصنف کے قلم کی فطری شوخی، اک نئے انداز سے رونما ہوئی ہے۔

عنقریب شائع ہونے والی ہے

مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

۳۶۷

۸۹۱۵۶۳۶۷

۳۲۶۹۹

Date	No.	Date	No.